امام بخش صہبائی
کی
ادبی خدمات

ڈاکٹر محمد ذاکر حسین

تقسیم کار
کتابستان
چندوارہ، مظفر پور (بہار)

امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات

ڈاکٹر محمد ذاکر حسین

نام کتاب	:	امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات
مصنف / ناشر	:	ڈاکٹر محمد ذاکر حسین
سال اشاعت	:	۲۰۰۲ء (اشاعت اول)
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	ڈی ٹی پی کمپیوٹرس، کاظمی بیگم کیمپس، پٹنہ سیٹی
تعداد اشاعت	:	۵۰۰

Title	:	Imam Bakhsh Sahbai ki Adabi Khidmat
Author /Publisher	:	Dr.Md.Zakir Hussain
year of Publication	:	2002 (1st edition)
Composing	:	DTP Computers, Kazmi Begum Campus, Patna City

انتساب

والد مکرم جناب الحاج

حافظ محمد محی الدین صاحب

اور

والدہ محترمہ خیر النساء صاحبہ کے نام

جن کی بے پناہ شفقت و محبت اور توجہ سے

میں

کسی لائق ہوا

☆☆

فہرست

پیش گفتار

اردو ادب کا بڑا المیہ یہ ہے کہ جب کوئی ادیب و شاعر اپنے عہد سے بڑا ہو جاتا ہے اور پھر وہ عہد اسی سے موسوم ہو جاتا ہے تو اردو والے اس ادیب و شاعر کی زندگی و فن سے متعلق معمولی سی معمولی باتوں کو اجاگر کرنے میں صفحات کے صفحات سیاہ کر ڈالتے ہیں۔ اپنے اس "محبوب عمل" میں وہ اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ پھر انھیں دنیا جہان کی کوئی خبر نہیں رہتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مخصوص ادیب و شاعر پر تحقیقات و تنقیدات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جس میں عام طور پر انھیں باتوں کا اعادہ ہوتا ہے جو قبلاً پیش کی جاچکی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر غالبؔ ہی کو لے لیجیے۔ آج کوئی بھی ادبی رسالہ یا جریدہ ایسانہ ملے گا، جس میں غالبؔ پر کوئی مضمون شایع نہ ہوا ہو اور وہ بھی اکثر نئی تحقیق و تنقید سے عاری۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اردو والوں کی اسی دکھتی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ "اردو کا مقدر آج یہ ہے کہ ہر حرف شناس بہ زعم خود اردو کا ذی وقار ادیب بن بیٹھتا ہے اور جھٹ پٹ غالبؔ پر ایک کتاب بھی لکھ ڈالتا ہے۔ اردو والوں کی یہی دکھتی رگ ہے، جس پر ہم کو فوراً انگلی رکھنی ہوگی اور اردو ادیب کو بتانا ہوگا کہ بھائی آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر اور بھی دنیا جہان کے مضامین ہیں جو آپ کی توجہ کے طلب گار ہیں۔" (اردو دنیا، نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ اردو کا ایک بڑا نام ہے اور اس کی عبقریت بھی مسلم ہے اور اس عبقریت کو نئی تحقیق کی روشنی میں پیش بھی کیا جانا چاہیے۔ لیکن ایسانہ ہو کہ خود غالبؔ کے عہد کے دوسرے لعل و جواہر اس "بے جا انہماک" کی وجہ

سے دفن کے دفن ہی رہ جائیں۔

اہل علم سے یہ مخفی نہیں خود غالبؔ کے عہد میں ایک سے ایک نابغہ روزگار منصۂ شہود پر جلوہ افروز تھے۔ انھیں میں ایک امام بخش صہبائیؔ بھی ہیں۔ جن کی فارسی دانی کے سب معترف ہیں اور ان کی اس خوبی کو اجاگر بھی کیا گیا ہے۔ لیکن اب تک ان کی اردو خدمات نظر انداز ہوتی چلی آرہی ہیں۔ حالانکہ صہبائیؔ نے اردو کی ہمہ جہت ترقی میں نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ ان کے زمانے تک اردو علم عروض سے نا آشنا تھی۔ انھوں نے ہی اردو کو پہلی مرتبہ علم عروض سے روشناس کرایا۔ اردو کے مایہ ناز اور شہرہ آفاق شعرا کا تذکرہ اردو میں بالکل نرالے اور اچھوتے انداز میں مرتب کیا۔ اردو صرف و نحو اور اردو لغات و ضرب الامثال پر اپنا زور قلم صرف کیا اور ضرورت پڑنے پر اردو میں طبع آزمائی بھی کی۔ اتنی خوبیوں کے مالک ہونے اور اردو کی ہمہ جہت ترقی میں نمایاں رول ادا کرنے کے باوجود ان کی اردو خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ اردو کے حوالے سے صہبائیؔ کی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔ اور اب تک ان کے ساتھ جو ناانصافی ہوتی چلی آرہی ہے، اس کا تدارک کیا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر راقم الحروف نے ان کا مطالعہ شروع کیا، جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ میری حقیر کوشش ہے اور اس میں کہاں تک میں کامیاب ہوا، وہ ذی وقار قارئین و ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ اگر اس میں کہیں خامی نظر آئے تو براہ کرم مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی اصلاح کر دی جائے۔

اخیر میں جناب پروفیسر عبدالمغنی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے نہ صرف میری اس کاوش کو سراہا بلکہ اس کے لیے ایک وقیع مقدمہ بھی عنایت فرمایا۔ ڈاکٹر محمد عابد حسین (لکچرر شعبہ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) اور جناب محمد بدرالدین فریدی (لائبریری اینڈ انفارمیشن اسسٹنٹ، خدا بخش لائبریری) بھی شکریہ کے مستحق

ہیں کہ انھوں نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ ساتھ ہی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے اس تالیف کی قدر و قیمت جان کر اس کی طباعت کے لیے مالی تعاون کی منظوری دی۔ اس کے علاوہ اپنے بھائیوں ماسٹر عبدالقادر (پرائمری اسکول، ڈلوکھر)، ڈاکٹر محمد صابر علی (ہائی اسکول تاج پور سمستی پور)، ڈاکٹر محمد صادق حسین (یو جی سی فیلو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)، عزیزم حافظ محمد زاہد حسین اور برادرم رضی اللہ خاں (سرجاپور، سوپول) کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے میری ہمت افزائی کی اور مشکل مرحلوں میں میرا ساتھ دیا۔ جناب سید شاہ مصباح الحق عمادی اور جناب انور وارثی کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنے تمام ذاتی کاموں کو پس پشت ڈال کر اس کتاب کی کمپوزنگ کے سلسلے میں دلچسپی دکھائی اور ان کے تعاون سے بہت تھوڑے ہی وقتوں میں کمپوزنگ کا کام مکمل ہو گیا۔

محمد ذاکر حسین

———

ذاکر حسین جانیں ان کو ادیب مانیں
مولد ہے ان کا بونسی ہے نزدِ بابو برہی
علم و ادب سے ان کا رشتہ بہت ہے گہرا
تصنیف فاخرہ کی دولت ہے ایک اچھی
گر یہ روش رہے گی منزل انہیں ملے گی

عبدالمنان طرزیؔ

(بحوالہ رفتگاں و قائماں نور بھنگہ کی منظوم ادبی تاریخ ص ۱۱۱)

پروفیسر عبدالمغنی

مقدمہ

انگریزی کے مشہور نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے کہا ہے کہ کسی بھی عہد اور اس کے ادب میں دوسرے درجے کے شاعروں کی اہمیت یہ ہے کہ وہی وہ ادبی ماحول بناتے ہیں جس میں درجہ اول کے شعراء نمودار ہوتے ہیں، لہٰذا ان کے کاموں کا مطالعہ بھی پورے طور پر کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ خود ایلیٹ نے مثال کے طور پر شیکسپیر کے ہمعصروں کا تنقیدی مطالعہ کیا اور ان کے کمالات پر روشنی ڈالی۔

اردو تنقید میں یہ کام زیادہ نہیں ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے طالب علم عہد غالب کے ایک بہت ہی باکمال ادیب و شاعر، صہبائیؔ، سے عام طور پر واقف نہیں۔ یہ ایک تاریخی خلا ہے جس کو پُر کرنے کے لیے پہلے بھی کچھ مطالعات ہوئے ہیں۔ اب ڈاکٹر محمد ذاکر حسین نے واقعہ یہ ہے کہ اپنی تحقیق سے بڑی حد تک اس خلا کو پُر کر دیا ہے۔ زیر نظر کتاب کے ابواب پر ایک نظر ڈالنے سے بھی موصوف کے اس کارنامے کا احساس ہوتا ہے:

عہد صہبائی

حیات صہبائی

صہبائی کی تصنیفات

اردو تخلیقات

فارسی نگارشات

صہبائی بحیثیت عروض داں / ترجمہ نگار

صہبائی بحیثیت تذکرہ نگار

صہبائی بحیثیت قواعد نگار / لغت نویس

صہبائی بحیثیت اردو شاعر

یہ فہرست صہبائی کی شخصیت اور ادبی خدمات کا احاطہ کرتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ مصنف نے موضوع کا ایک جامع تعارف مندرجہ بالا ابواب میں کرایا ہے، بلکہ ہر باب میں عالمانہ و محققانہ بحثیں کر کے متعلقہ واقعات و حقایق کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔ کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں محض اعداد و شمار نہیں دیے گیے ہیں، نکات کی تصریح ایک صاف و سلیس انداز سے کی گئی ہے۔ چنانچہ کتاب سے نہ صرف ماہرین استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ عام ادبی ذوق رکھنے والے قارئین بھی اس کا مطالعہ دل چسپی سے کر سکتے ہیں۔ ہر موضوع بحث کی تفصیل و تشریح سادہ اور دل نشیں طریقے سے کی گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اب تک صہبائی کے متعلق اردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر یہ کتاب وقیع اضافہ ہے۔ اس کے مطالعے سے توقع ہوتی ہے کہ مستقبل قریب میں انشاء اللہ اردو کو ایک قابل ذکر محقق ملے گا۔ اس سلسلے میں مصنف کی کاوش و جستجو اور اس کا معروضی و علمی اسلوب بیان لایق ستایش اور بہت امید افزا ہے۔

یہ کتاب ریسرچ کے رائج الوقت کاروباری انداز سے مختلف طریقے پر لکھی گئی ہے۔ یہ صحیح معنوں میں اصلی تحقیق ہے، نقل در نقل نہیں۔ اس میں خانہ پری اور حشو و زواید نہیں۔

اہل علم اور اصحاب ذوق سے توقع ہے کہ نوجوان محقق کی کوشش کی پذیرائی کریں گے اور داد دیں گے۔
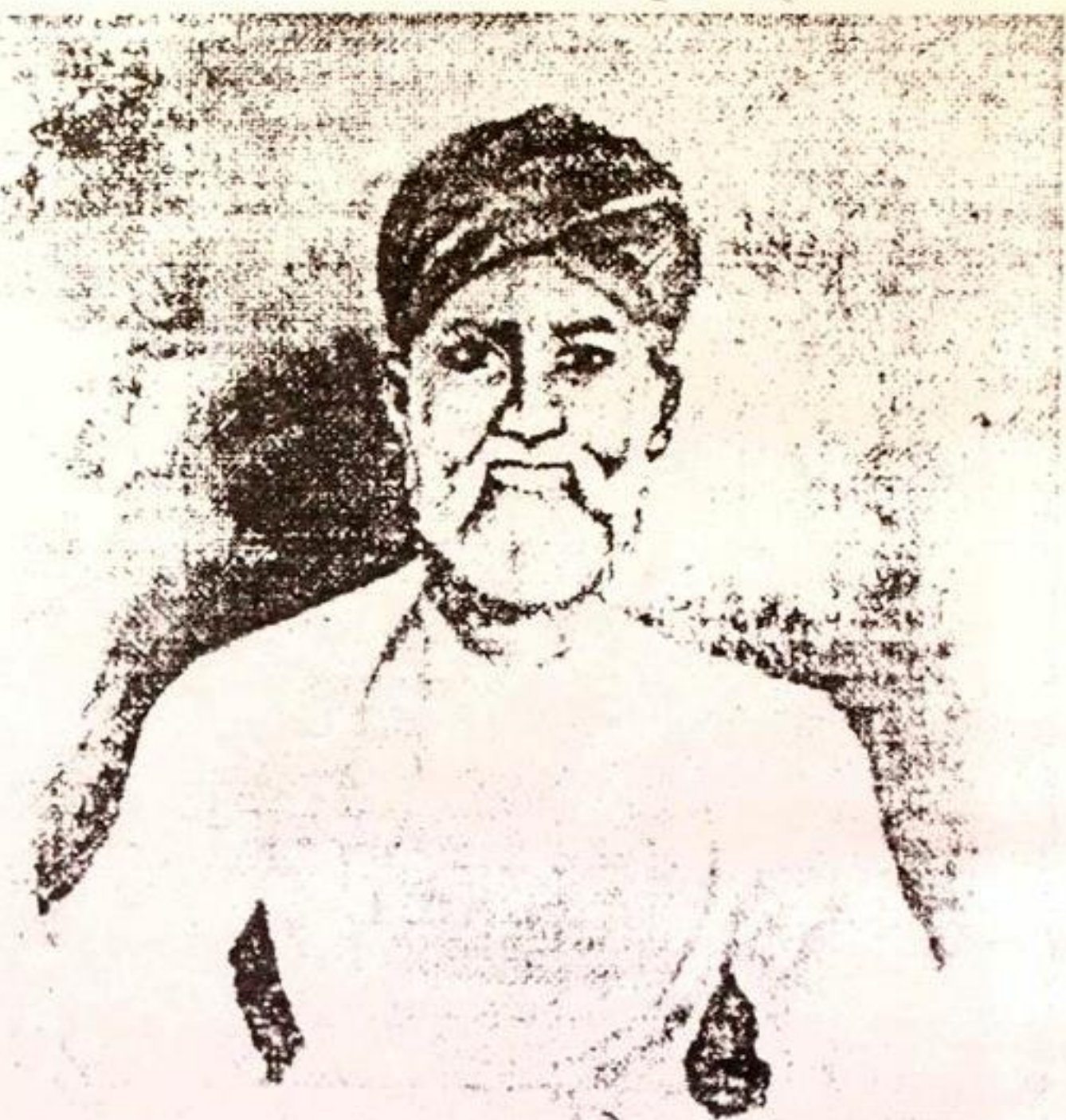
مولانا امام بخش صہبائی

عہد صہبائی

انیسویں صدی کا ہندستان گوناگوں مسائل اور نوع بہ نوع مشکلات سے گھرا ہوا تھا۔ ہر سو خطرات وخدشات کے بادل منڈلا رہے تھے اور خوف ودہشت کی بدلی چھائی ہوئی تھی، کشت وخوں کا بازار گرم تھا۔ انارکی اور بدامنی کا زہر سارے برصغیر میں پھیل چکا تھا۔ لوگ بے اطمینانی اور بے یقینی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور انگریز کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ان کی حالت دگرگوں، قابل دید اور قابل رحم تھی اور اس غلامی کی زندگی سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ مغل جو صدیوں سے ہندستان پر بڑی شان وشوکت، جاہ وجلال اور رعب ودبدبہ کے ساتھ حکومت کرتے چلے آرہے تھے اب ان کا ستارۂ اقبال بھی گہن آلود ہوکر زوال وانحطاط کے دہانے پر آچکا تھا۔ صدیوں کی فرمانروائی اور حکمرانی نے قوم کو عیش وعشرت اور سستی وتن آسانی کا خوگر بنادیا تھا۔ جمود وتعطل اور بے حسی اس درجہ غالب آچکی تھی کہ مفکرین ان کے مستقبل سے مایوس ہونے لگے تھے۔ اس دور کی ایک دردناک تصویر حالیؔ نے اپنے ان اشعار میں پیش کی ہے ؎

چمن میں ہوا آچکی ہے خزاں کی
پھری ہے نظر دیر سے باغباں کی
صدا اور ہے بلبل نغمہ خواں کی
کوئی دم میں رحلت ہے اب گلستاں کی
تباہی کے خواب آرہے ہیں نظر سب
مصیبت کی ہے آنے والی سحر اب

اس سیاسی اتھل پتھل، اتار چڑھاؤ اور ہرج مرج کے اثرات فارسی زبان وادب پر بھی پڑنے لگے، جس زبان کا صدیوں تک سکہ رائج تھا اب وہ بیچارگی میں چراغ سحری

ہو رہی تھی۔ حالانکہ ہمارے ملک ہندستان میں فارسی زبان وادب کی روایت بہت قدیم اور شاندار رہی ہے اور یہاں اس زبان کا ماضی جتنا روشن و تابناک اور جتنا عروج و قبول اس کو حاصل رہا ہے، وہ اہل علم حضرات سے مخفی نہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب محمد بن قاسم کا لشکر اس ملک میں فاتحانہ شان و شوکت سے داخل ہوا تو اسی مٹی میں رچ بس گیا اور یہاں کے باشندوں نے ان کی شہرہ آفاق زبان "عربی" کو ایسا اپنایا کہ بعض معاملوں میں وہ اہل زبان سے بھی چار قدم آگے نکل گئے۔ اور یہی معاملہ فارسی زبان کے ساتھ بھی روا رکھا گیا اور رفتہ رفتہ اس کا دامن پورے ملک میں وسیع ہوتا چلا گیا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کی ساتویں دہائی میں فارسی زبان کا عمل دخل ہندستان میں موجود تھا۔ جب بشاری مقدسی ۳۷۵ھ / ۹۸۵ء میں ملتان پہونچے تو انھوں نے دیالمہ کے فارسی خطبے سندھ اور ملتان میں بالعموم رائج پائے (۱)۔ سلطان سبکتگین (۳۶۶۔۳۸۷ھ) اور سلطان محمود غزنوی (۳۸۸۔۴۲۱ھ) کے ساتھ خاصی تعداد میں علما و مشائخ ہندستان تشریف لائے اور ہندستان کے شمالی و مغربی علاقے میں آباد ہوگئے۔ چنانچہ سب سے پہلے شیخ اسمٰعیل بخاریؒ نے ۱۰۰۵ء میں لاہور کو مسکن بنایا (۲)۔ پھر شیخ علی بن عثمان ہجویری داتا گنج بخش (۱۰۰۹۔۱۰۷۲ء) نے غزنی کو خیر آباد کہہ کر اسی سرزمین کو اپنا مستقر بنایا، کشف المحجوب ان کا ہی شاہکار ہے۔ اس کے دیباچہ میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے ان کا دیوان غصب کر لیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور صاحب دیوان بھی۔ پھر شیخ رضی الدین صنعانی (۱۱۸۱۔۱۲۵۲ء) نے لاہور کو مسکن بنایا۔ "مشارق الانوار" ان کی تصانیف میں کافی شہرت رکھتی ہے۔ ان صوفیا کی بدولت لاہور فارسی زبان وادب کا مرکز اور ثانی غزنین شمار کیا جانے لگا۔

البتہ باقاعدہ طور پر فارسی کا آغاز غزنوی اور غوری فاتحوں کی آمد سے ہوا۔ جب ۶۰۲ھ میں قطب الدین تخت دہلی پر متمکن ہوا تو فارسی ہی درباری اور علمی

زبان قرار پائی (۳)۔ سرکاری اور درباری زبان بننے کے بعد فارسی کی ترقی بہت تیزی سے ہونے لگی۔ لوگ فارسی کی تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے لوگ بھی اس طرف متوجہ ہوئے چنانچہ سکندر لودی (جلوس ۸۹۴ھ) کے عہد حکومت میں کایستھوں نے فارسی سیکھی اور ہندوؤں کے دوسرے طبقوں کا دھیان بھی اس طرف مبذول ہونے لگا۔ پھر تو ہر جگہ فارسی کی طوطی بولنے لگی اور اس کا قدم اس ملک میں اس درجہ مستحکم ہو گیا کہ خاندانوں کے عروج و زوال اور حکومتوں کے بننے اور بگڑنے سے اس پر ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا اور اس کا سکہ ہمیشہ رائج رہا یہاں تک کہ مغلوں کا زریں دور آگیا۔ اس زریں دور میں فارسی زبان و ادب کی جو ترقی ہوئی وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن اور تابناک باب ہے۔ یہ سلسلہ مدتوں چلتا رہا۔ پھر انیسویں صدی کا پر خطر دور آگیا اور ہندستان کی باگ ڈور کمپنی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ کمپنی حکومت نے ۱۸۳۵ء میں فارسی کا سرکاری درجہ چھین کر اردو کو دے دیا، جو کم و بیش چھ سو سالوں سے اس ملک میں ادبی ضیاپاشی کر رہی تھی۔

لیکن یہ قانون فطرت ہے کہ چراغ گل ہونے سے قبل اپنی بھڑک ضرور دکھاتا ہے۔ دہلی میں اگرچہ مغلیہ حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا مگر شعر و ادب کا آفتاب نصف النہار پر تھا جسے "فارسی کی شمع فروزاں کی آخری بھڑک کہا جاتا ہے (۴)"۔

جیسا کہ قبلاً ذکر ہوا کہ ہندستان کی سرزمین ایسی دامن گیر ہے کہ وہ ہر داخلی اور خارجی اشیاء کو اپنے اندر ایسا جذب کر لیتی ہے کہ وہ اسی کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ عربی اور فارسی زبانیں جب یہاں وارد ہوئیں تو یہاں کے باشندوں نے صدیوں ان کو اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ جب اردو کا وجود ظہور میں آیا تو یہاں کے رہنے والوں نے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جیسا عربی اور فارسی کے ساتھ کیا تھا۔ البتہ برسوں مرکزیت کی تلاش میں یہ زبان بھٹکتی رہی لیکن جب کمپنی کے عہد میں اس زبان کو فارسی کی جگہ سرکاری درجہ دیا گیا تو اس زبان کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی

اور فارسی داں بھی اردو کی طرف راغب ہونے لگے۔

دہلی شروع ہی سے علما و فضلا کا مرکز، ادبا کا گہوارہ اور شعرا کا مخزن رہا ہے۔ علم و ادب اس کی گود میں نشو و نما پا کر جوان ہوا۔ حضرت امیر خسرو (۱۲۵۳ـ۱۳۲۵ء) پرانی دہلی کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن است کہ آباد باد
مردم او جملہ فرشتہ سرشت
خوش دل و خوش خوی چو اہل بہشت
بیشتر از علم و ادب بہرہ مند
و اہل سخن خود کہ شمارد کہ چند (۵)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۳ء) ایک عربی نظم میں جس کو سر سید نے ''آثار الصنادید'' میں نقل کیا ہے، اسی دہلی کے اوصاف بتاتے ہوئے رقمطراز ہیں ؎

یا من یسال عن دھلی و رفعتھا
علی البلاد و ما حازتہ من شرف
ان البلاد اماء و ھی سیدۃ
و انھا درۃ و الکل کالصدف
فیھا مدارس لو طاف البصیر بھا
لم تنفتح عینہ الا علی الصحف (۶)

صہبائی کے دور میں دہلی کا جو مقام تھا، اس کی تصویر کشی مولانا عبدالحی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''گل رعنا'' میں کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''دلی اس وقت آج کی ایسی دلی نہیں تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر

امام بخش صہبائیؔ، علامہ عبد اللہ علویؔ، مفتی صدر الدین آزردہؔ، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، نواب ضیاء الدین نیرؔ، شاہ نصیر الدین نصیرؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، حکیم آغا جان عیشؔ، حافظ عبد الرحمن خاں احسانؔ، میر حسن تسکینؔ اور خدا جانے کتنے سخنوران با کمال کا جمگھٹا ہوگا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہونگے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔ ''(۷)

مفتی انتظام اللہ شہابیؔ لکھتے ہیں:

''فارسی زبان کا چراغ ہندستان میں مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی طبعی عمر اختتام کے قریب تھی۔ مگر حسن اتفاق دیکھیے کہ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے زمانے میں کچھ اس نے سنبھالا لیا تھا کہ چند صاحبان فضل و کمال خاص دار الخلافہ میں آ جمع ہوئے۔ کچھ خاک دہلی سے پیدا ہوئے، کچھ حضرات باہر سے آئے۔ ہر ایک یگانہ روزگار تھا۔ یہ لوگ علم و فضل کے ساتھ ساتھ شعر و سخن میں بھی صاحب کمال تھے۔ ''(۸)

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اس عہد کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ ملاحظہ ہو:

''یہ وہ عہد ہے جب دہلی عروس البلاد بنا ہوا تھا۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ مختلف علوم و فنون میں جو ارباب فضل و کمال اس عہد کی زینت تھے۔ اس کی مثال ایسے نا مساعد حالات میں کسی دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔ ''(۹)

حکومت مغلیہ کے زوال و انحطاط، عام امراء کی تعیش کوشی اور اس دور میں انگریزوں کے روز افزوں تسلط کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید اہل ہند اپنی توانائی کھو چکے تھے۔ لیکن جب معاشرہ کی مجموعی زندگی پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ دور دراصل ان کی دینی، فکری، سیاسی، علمی اور ادبی نہضت کا دور تھا۔ اس دور میں جب کہ گھر گھر اردو کا چرچا عام تھا، فارسی کے کچھ دیوانے ایسے بھی تھے جو اس قومی و ملی

سرمایے کو سینے سے لگائے ہوئے زمانے کے حوادث کا سامنا کر رہے تھے۔ بقول ضیاء احمد بدایونی:

"حکومت مغلیہ کے دور انحطاط میں جب کہ بر صغیر ہند و پاک میں گھر گھر اردو کا کلمہ پڑھا جاتا تھا۔ کچھ لوگ "آتش پارسی" کے بھی پجاری تھے، جن کی شعلہ نوائیوں سے بزم سخن میں گرمی پیدا ہو جاتی تھی۔" (۱۰)

اور ڈاکٹر سمیع الدین کی زبان میں:

"سیاسی اور اجتماعی انتشار، بد امنی اور کش مکش اور ابتلا کے باوجود شمالی ہندستان بالخصوص دہلی میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا چلن باقی تھا اور فارسی زبان و ادب کی گرم بازاری ہنوز قائم تھی۔ اس پر آشوب دور میں ایسے ادیبوں اور عالموں کی کمی نہیں تھی جنھوں نے اردو کے فروغ و ارتقا کے باوجود فارسی کو اپنے افکار و مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ وہ اس دور انحطاط میں بھی فارسی زبان سے تعلق اور اس میں دستگاہ کو گویا علمیت اور فضیلت کی سند منظور کرتے تھے۔" (۱۱)

الغرض صہبائی کا دور علمی، ادبی اور فکری اعتبار سے ایک حوصلہ افزا، پر لطف اور پر بہار دور تھا اور کاملین فن کی ایسی جماعت موجود تھی جو عہد غزنویہ اور سلاجقہ کے اکابر کی یاد دلاتی تھی۔

حواشی:

۱۔ احسن التقاسیم ص ۴۸۱

۲۔ فوائد الفواد ص ۲۵

۳۔ مسالک و منازل ص ۳۳۲

۴۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ۵ / ۲۵۷

۵۔ بحوالہ غالب نامہ، جولائی ۱۹۸۲ء (عہد غالب کا علمی و فکری ماحول / شبیر احمد غوری)

۶۔ آثار الصنادید ص ۵۲۲

۷۔ گل رعنا ص ۳۲۶

۸۔ غدر کے چند علما ص ۵

۹۔ غالب نامہ، جولائی ۱۹۸۱ء (مولانا صہبائی کا انتخاب دواوین ص ۱۵۸)

۱۰۔ مسالک و منازل ص ۳۳۳

۱۱۔ غالب نامہ، جنوری ۱۹۸۴ء، ص ۸۰

حیات صہبائی

نام و نسب

امام بخش نام، صہبائؔی تخلص (۱)۔ صہبائی کو "معمائی" بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ ان کو فن معما سے کافی دلچسپی تھی اور اس فن میں ید طولی رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا نام صہبائی معمائی پڑ گیا تھا۔ چنانچہ "قول فیصل" کے سرورق پر ان کا نام اس طرح ملتا ہے "محقق زماں مولانا امام بخش مغفور معمائی متخلص بہ صہبائؔی" اور "کلیات صہبائی" کے سرورق پر بھی ان کا نام اسی طرح ملتا ہے "فہرست رسایل کلیات مولانا امام بخش معمائی متخلص بہ صہبائی"۔

قدیم تذکروں میں صہبائؔی کے والد کا نام نہیں ملتا ہے۔ حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ مولوی کریم الدین، منشی دین دیال، مرزا قادر بخش صابؔر اور سرسید کی تصانیف میں دیرینہ قرابت کے باوجود ان کے والد کا نام نہیں ملتا ہے۔ مرزا قادر بخش صابؔر کی کتاب "گلستان سخن" میں صہبائؔی کے بزرگوں کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے:

> "حضرت کے آبائے کرام و اجداد عظام سے اکثر ایسے ہیں کہ ان کا قامت احوال یا لباس سربلندی ظاہری سے آراستہ یا زیور کمالات باطنی سے پیراستہ۔" (۲)

البتہ خود صہبائؔی نے اپنی ابتدائی تصنیف "شرح معمای ہمدانی" میں اپنے والد کا نام مولانا محمد بخش تھانیسری لکھ دیا ہے۔

صہبائؔی کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ اور والدہ کی جانب سے سید الثقلین غوث اعظم عبد القادرؒ تک پہنچتا ہے۔ (۳)

وطن

صہبائی کا آبائی وطن تھانیسر تھا، ان کے والد تھانیسر ترک کر کے "کوچہ چیلاں" دہلی میں آکر سکونت پذیر ہوگئے تھے (۴)۔ اور یہیں صہبائی کی ولادت ہوئی (۵)۔ قصیدہ کے ایک شعر میں خود صہبائی نے اپنے وطن اور مولد کی طرف ضمناً اشارہ کردیا ہے

حسن از دہلی و من ہم ز دہلی لیکن ایں بنگر
کہ قطرہ ہم نم و ہم در بود یک ابر نیساں را (۶)

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے اپنی کتاب "صہبائی ایک مختصر تعارف" میں اس شعر کو غزل کا شعر قرار دیا ہے (۷)، جو درست نہیں ہے۔ دراصل یہ شعر اس قصیدہ کا ہے، جس میں صہبائی نے اپنے حبیب لبیب سر سید احمد خاں کی مدح سرائی کی ہے اور جس کا مطلع یہ ہے

ز بس در سینہ جا دادیم عشقِ آتش افشاں را
شرر گل می کند از ہر نفس آہنگِ افغاں را (۸)

سال ولادت

صہبائی کے سال ولادت کے بارے میں اب تک جن لوگوں نے لکھا ہے، ان سب کے ماٰخذ مولوی کریم الدین اور اسپرنگر ہیں۔ مولوی کریم الدین جو صہبائی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ان کی عمر کے بارے میں قیاس آرائی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"عمران کی بالفعل اس سال یعنی ۱۲۶۱ھ میں قریب چالیس (۴۰) برس کی ہوگی۔" (۹)

اور ڈاکٹر اسپرنگر نے اودھ کیٹلاگ مطبوعہ ۱۸۵۴ء میں لکھا ہے کہ "صہبائی کی

عمر تقریباً ساٹھ سال ہے" (۱۰)۔ گارساں دتاسی نے مولوی کریم الدین اور ڈاکٹر اسپرنگر کی رایوں کا تجزیہ کر کے جو اپنا فیصلہ دیا ہے۔ وہ یہ ہے:

"کریم الدین ۱۸۴۷ء میں ان (صہبائی) کی عمر ۴۰ بتائی تھی۔ لیکن ڈاکٹر اسپرنگر جو ان کو جانتے تھے، یہ کہتے ہیں کہ وہ ۱۸۵۴ء میں ساٹھ کے تھے۔"(۱۱)

اخلاق دہلوی نے بھی اپنی کتاب "مضمون نگاری" میں دونوں کی رایوں کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اسپرنگر نے، جو صہبائی سے واقف تھے، ۱۸۵۴ء میں ان کی عمر اندازاً ساٹھ سال بتائی ہے۔ اس حساب سے سنہ پیدائش ۱۷۹۵ء میں ہونا چاہیے۔ مگر مولوی کریم الدین، جو صہبائی کے دوست بلکہ ہم پیشہ و ہم مشرب تھے اور ان سے خوب اچھی طرح واقف تھے، انہوں نے ۱۸۴۷ء میں اندازاً چالیس سال عمر بتائی ہے۔ اس اعتبار سے سن پیدائش ۱۸۰۸ء ہونا چاہیے۔ مولوی کریم الدین ہندوستانی تھے، اس لئے ان ہی کا تخمینہ ہمارے نزدیک قرین قیاس اور قابل ترجیح ہے۔ بہر حال اتنا مان لینے میں مضائقہ نہیں کہ وہ ۱۷۹۵ء اور ۱۸۰۸ء کے درمیان کسی سنہ میں پیدا ہوئے۔"(۱۲)

گارساں دتاسی کی تحریر میں چند باتیں غور طلب ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ مولوی کریم الدین نے ۱۲۶۱ھ میں ان کی عمر چالیس سال بتائی تھی اور ۱۲۶۱ھ کا مطابق ۱۸۴۵ء ہوتا ہے نہ کہ ۱۸۴۷ء جیسا کہ گارساں دتاسی نے لکھا ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ اودھ کٹیلاگ ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا تھا اور اسپرنگر نے اس کو ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان مرتب کیا تھا۔

۳۔ ان کا یہ کہنا کہ ڈاکٹر اسپرنگر ان کو جانتے تھے تو کیا مولوی کریم الدین سے

صہبائی کے تعلقات نہیں تھے؟

اخلاق دہلوی بھی اس کو سمجھ نہ پائے اور گارساں دتاسی کی طرح وہ بھی ۱۸۴۵ء کو ۱۸۴۷ء سمجھ بیٹھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولوی کریم الدین کا ہی تخمینہ درست ہے۔ اس کے مطابق صہبائی کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں ہوئی تھی۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی بھی مولوی کریم الدین سے متفق نظر آتے ہیں (۱۳)

ڈاکٹر خواجہ محمد حامد کے مطابق ڈاکٹر اسپرنگر کی تحقیق کے سلسلے میں گارساں دتاسی کو سہو ہو گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنے تالیف کردہ اودھ کیٹلاگ مطبوعہ ۱۸۵۴ء میں لکھا ہے کہ صہبائی کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے۔ گارساں دتاسی سمجھے کہ ڈاکٹر اسپرنگر کے نزدیک صہبائی کی عمر ۱۸۵۴ء میں ۶۰ سال تھی۔ حالانکہ خود ڈاکٹر اسپرنگر نے جو تصریح اودھ کیٹلاگ کے دیباچہ میں کی ہے اس کے مطابق یہ کیٹلاگ سوم مارچ ۱۸۴۸ء اور یکم جنوری ۱۸۵۰ء کے درمیان مرتب ہوا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے ۱۸۵۴ء میں نہیں بلکہ ۴۹-۱۸۴۸ء میں صہبائی کی عمر ساٹھ سال بتائی تھی۔" (۱۴)

اوپر جو اطلاعات فراہم کی گئیں وہ سب خارجی اور مشکوک ہیں جب داخلی شہادت موجود ہو تو خارجی اطلاعات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ صہبائی نے خود اپنی تصنیف "شرح نصیرا ی ہمدانی" کے خاتمہ میں اپنی عمر کے بارے میں اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"درین مدت تگاپوی عمر کہ از گلگشت خیابان عشرہ سوم مائل عشرہ چہارم است از منشآت متداولہ عبارت مرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمۃ"۔ (۱۵)

مذکورہ عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ عشرہ سوم تمام ہونے کو ہے اور عشرہ

چہارم شروع ہونے والا ہے۔ اگر مذکورہ عبارت کے لفظ ''مائل'' کو معنی موضوع لہ پر محمول کریں تو علم عدد کے حساب سے اس وقت صہبائی کی عمر ۳۰ سال مکمل مانی جائے گی۔ اور صہبائی نے ''شرح نصیرای ہمدانی'' کو ۱۲۴۷ھ میں لکھا تھا جیسا کہ خاتمہ کے تاریخی قطعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ قطعہ تاریخ یہ ہے ع

''ہاتف غیب گفت خامش شو'' (۱۶)

مذکورہ مصرعہ میں مادہ تاریخ ''خامش شو'' ہے، جس سے ۱۲۴۷ نکلتا ہے۔ اس داخلی شہادت اور مذکورہ تشریحات کے بناء پر ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کے مولوی کریم الدین اور ڈاکٹر اسپرنگر کا تخمینہ درست نہیں ہے۔ اس لیے کلی اعتماد کے ساتھ صہبائی کا سال ولادت ۱۲۱۷ھ / ۳۔۱۸۰۲ء قرار دیا جا سکتا ہے۔

تحصیل علم و کسب فیض

امام بخش صہبائی کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی۔ کوئی ٹھوس معلومات فراہم نہیں ہیں، جن سے اس کے بارے میں رہنمائی حاصل کی جائے۔ نیز اس سلسلے میں سارے تذکرے بھی خاموش ہیں۔ صرف قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ اپنے والد بزرگوار سے ابتدائی تعلیم حاصل کی (۱۷)۔ چونکہ صہبائی کے پدر والا قدر اپنے دوُر کے نامی گرامی اشخاص میں شمار ہوتے تھے اور لوگوں میں مقبول بھی تھے اور قد آور لوگوں سے گہرے مراسم بھی۔ اس لئے ان کے دونوں بیٹوں کو دہلی کے بہترین استادوں اور عالموں تک رسائی اور ان سے کسب فیض کے مواقع میسر آئے۔ چنانچہ جب اپنے والد سے تحصیل علم کے بعد کچھ لائق ہوئے تو مولوی عبداللہ خاں علویؔ جیسے استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقعہ ملا۔ مولوی کریم الدین لکھتے ہیں

''عبداللہ خاں فارسی خواں جو شاہجہاں آباد میں مشہور تھے، ان سے تحصیل فارسی کی اور کتب عربیہ بھی متفرق جاے پڑھیں۔ طب میں

دست قدرت رکھتے ہیں، نفیسی وغیرہ پڑھا دیتے ہیں"۔(۱۸)

مولوی کریم الدین اگر "متفرق جا" کی تفصیل بتا دیتے تو بہت ساری معلومات ان کی تعلیم کے بارے میں حاصل ہو جاتی۔

مولوی عبداللہ خاں علوی ایک علامہ روزگار، یگانہ دہر، فاضل عصر اور یکتائے زمانہ شخص تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے سر سید لکھتے ہیں:

"مولوی عبداللہ خاں متخلص بہ علوی، سن شریف آپ کا چالیس سے اور کمال ظاہری و باطنی ہزار سے متجاوز تھا۔ اگرچہ وطن و مولد شمس آباد تھا۔ لیکن چونکہ ایام طفلی سے بود و باش حضرت شاہجہاں آباد میں رہی تھی۔ گویا یہی وطن ہو گیا۔ بسبب استعداد خداداد کے ہر فن میں ید طولی رکھتے تھے۔ خصوصاً نظم و نثر تازی و دری میں اور چونکہ فن فارسی میں خواہ باعتبار انشا، نظم و نثر کے خواہ باعتبار درس و تدریس کے مزاولت بہ کمال اور مشغولی اوقات بہت رہی تھی۔ اس فن کی نسبت سے شہرت پائی تھی --- چونکہ فن طبابت میں معجزہ مسیحا اور ید بیضا رکھتے تھے۔ اس نواح میں اکثر آدمیوں نے ان کے علاج کی برکت سے امراض صعب سے نجات پائی --- وہیں ۱۲۶۳ھ میں عالم باقی کی طرف راہی ہوئے -- نظم و نثر سے صفحہ عالم پر بہت یادگار ہے۔"(۱۹)

عبداللہ خاں علوی کی عمر کا جو تخمینہ سر سید نے پیش کیا ہے اس پر اعتراض کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد انصار اللہ لکھتے ہیں:

"مولوی عبداللہ خاں کی عمر کے بارے میں سر سید کا تخمینہ بہت صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ وہ یقینی طور سے صہبائی سے کافی بڑے تھے اور بوقت انتقال ان کی عمر چالیس سے بھی بہت زیادہ رہی ہو گی۔"(۲۰)

ڈاکٹر موصوف کا یہ اعتراض بالکل ہی بے محل ہے۔ کیونکہ نہ تو انہوں نے کوئی ٹھوس ثبوت پیش کیا ہے کہ بوقت انتقال ان کی عمر چالیس سے بہت زیادہ ہوگی۔ صرف ''رہی ہوگی'' کوئی معیار نہیں ہے۔ اگر قیاساً ہی کہہ رہے ہیں تو سر سید کا تخمینہ اور قیاس ڈاکٹر انصار اللہ سے زیادہ معتبر ہے کیونکہ وہ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا ضیاء احمد بدایونی، عبداللہ خاں علوی کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صہبائی کے استاد عبداللہ خاں علوی ایک فاضل عصر اور کامل دہر شخص تھے، جن کی سخنوری کے غالب بھی معترف ہیں۔'' (۲۱)

غالب جیسے خود بیں اور انا پسند شخص نے بھی علوی کی برتری تسلیم کی ہے، اس سے ان کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ہے

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جان گرچہ نیرزد بشمار
ہست در بزم سخن ہم نفس وہمدم شان (۲۲)

مولوی عبداللہ خاں علوی جیسے نابغہ روزگار کی شاگردی، استاد کی توجہ اور صہبائی کی خداداد صلاحیت نے ان کو بقول سر سید ہر فن میں یک فنی بنا دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر خواجہ محمد حامد لکھتے ہیں:

''تحصیل علم میں صہبائی کی قسمت اچھی تھی کہ خوش حالی سے محروم ہونے کے باوجود انہیں اچھا استاد ملا۔ یعنی مولوی عبداللہ خاں علوی قائم گنجی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ صہبائی نے استاد کی توجہ سے صرف فارسی میں کمال حاصل نہیں کیا بلکہ عربی صرف و نحو پڑھی اور چند کتب عربیہ کا درس بھی متفرق مقامات سے لیا۔ نیز معانی و منطق کی تحصیل کی اور علم عروض و قافیہ اور فن معما میں نمایاں دستگاہ بہم پہونچائی --- یہ

مولوی عبداللہ خاں علوی کا فیض تربیت تھا کہ صہبائی کم عمری ہی میں فارسی میں شعر کہنے لگے۔" (۲۳)

الغرض صہبائی نے تمام متداولہ اور مروجہ علوم و فنون کو ماہر، لائق اور فائق استادوں سے حاصل کیا اور اس میں نمایاں دستگاہ بہم پہنچائی اور استاد کی توجہ اور رغبت نے ان کو اس مرتبہ تک پہنچا دیا جہاں تک رسائی سے اکثر و بیشتر لوگ قاصر رہتے ہیں۔

فضل و کمال

صہبائی کی ذات گوناگوں صفات، نوع بہ نوع خصائل، ہمہ گیر خوبیوں اور متنوع کمالات کا مجموعہ تھی۔ ان کی ذات میں بیک وقت بہت ساری خوبیاں جمع تھیں۔ وہ بیک وقت ایک قادرالکلام شاعر، صاحب طرز انشاپرداز، دقیقہ رس شارح، نکتہ بیں محقق اور فنون شعر کے رمز شناس تھے۔ تحقیق لغات واصطلاحات زبان فارسی، تدقیق مقامات کتابی، تفحص نکات عروض و قافیہ اور استکمال فن معما میں ان کا کوئی ثانی اور نظیر نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام معاصرین واخلاف ان کے پایۂ علم و فضل کے معترف نظر آتے ہیں۔ سرسید نے، جو ان کو عزیز دوست ہی نہیں بلکہ بزرگ بھائی کی حیثیت سے رکھتے تھے، ان کی شخصیت کی تصویر کشی میں وہی مسجع و مقفیٰ اسلوب تحریر اختیار کیا ہے جو خود صہبائی کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

> "زنگ زدای آئینہ سخنوری، مصقل مرأت معنی پروری، نخلبند حدیقہ کمالات صوری، پردہ کشای حسن جلائل معنوی، معجزہ طراز طرز تازہ، بزم افروز حمائدبی اندازہ، ساقی خم کدۂ سخن سرائی مولوی امام بخش متخلص بہ صہبائی۔" (۲۴)

صہبائی کے لائق و قابل شاگرد مرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرہ "گلستان سخن" میں نہایت عقیدت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے:

"صہبائی تخلص جناب فیض انتساب، حضرت استاذی، استاد الانامی، قدوہ کملائی روزگار، اسوۂ افاضل شہر و دیار، ماہر فنون عجیبہ، واقف علوم عربیہ مخدومی مولائی مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ۔" (۲۵)

مولوی کریم الدین، صہبائی کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فارسی میں بڑی قدرت رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کتب فارسی سے مثل ان کے کوئی ماہر نہیں۔ تمام کتب فارسیہ پر عبور ہے۔ کتب عربیہ میں سے صرف و نحو اور معانی و منطق بھی جانتے ہیں۔ مگر بجز فارسی اردو شعر نہیں کہتے ہیں۔" (۲۶)

نواب صدیق حسن خاں کی رائے ہے:

"صہبائی مولوی امام بخش در فنون و علوم رسمی پایہ بلند داشت و در فارسی دانی و مہارت درس کتب این زبانی منصب ارجمند۔ شروح و فواتح و خواتیم کتب متعلقہ درسیہ زبان فرس ازوی یادگار است۔ خصوصاً رسالہ "قول فیصل" کہ بطریق محاکمہ درمیان حزیں و آرزو نوشتہ، در آن داد تحقیق وانصاف دادہ--- در تحقیق لغت فرس و مصطلحات زبان دری و تکمیل عروض و قافیہ واستکمال فن معما فرد روزگار بود۔" (۲۷)

مفتی صدر الدین آزردہ نے جو رائے صہبائی کے بارے میں پیش کی تھی، اس سے ان کا مقام اور درجہ بخوبی متعین ہو جاتا ہے اور ان کا فضل و کمال نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے:

"ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین ہیں۔ ایک مرزا نوشہ دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی" (۲۸)

مرزا اسد اللہ خاں غالب جیسے بت شکن نے اپنی نظم و نثر میں ان کی علمی صلاحیت اور فکری استعداد کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں:

ای کہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم	چہ بمامنت بسیار نہی از کم شان
ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود	باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ	حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جان گرچہ نیرزد بشمار	ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شان

صہبائی اپنی قابلیت اور خداداد استعداد کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور لوگوں میں ان کا مرتبہ بلند اور قدر و منزلت کافی بڑھی ہوئی تھی۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔" (۲۹)

دربار سے تعلق

صہبائی نے جب اس عالم رنگ و بو میں اپنی آنکھیں کھولیں تو اس وقت حکومت کی باگ ڈور شاہ عالم ثانی (م ۱۲۲۱ھ) کے ہاتھوں میں تھی۔ زمانہ طفلی انہیں کے عہد حکومت میں گذرا اور جب ایام طفولت کی منزلیں طے کر کے ایام شباب میں داخل ہوئے تو اس وقت دہلی کے تخت پر اکبر شاہ ثانی (م ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ / ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) جلوہ افروز تھے۔

صہبائی، شاہ عالم ثانی کے بہت بڑے عقیدت مند تھے۔ چنانچہ جب سوجھ بوجھ ہوئی اور کچھ لائق ہوگئے تو انہوں نے ان کے متعلق ایک قطعہ تاریخ موزوں کیا۔ شاہ عالم ثانی کو عالم شاہزادگی میں "عالی گہر"، بادشاہ کے بعد "شاہ عالم" اور مرنے کے بعد "فردوس منزل" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ صہبائی نے ان تینوں خطاب کو اپنے قطعہ میں پوری مہارت اور برجستگی سے نظم کیا ہے۔ تاریخ وفات شاہ عالم بہ تعمیہ

ہے

حضرت فردوس منزل شاہ عالم بادشاہ رفت ازین دار فنا کرد در جنت مقام
سال تاریخ وفات آن شہ عالی گہر دل زروی نالہ گفتا ہفتم شہر صیام (۳۰)

50+1171=1221

اسی طرح اکبر شاہ ثانی کی تاریخ جلوس پر بھی ایک قطعہ موجود ہے۔ تاریخ جلوس اکبر شاہ ثانی

بہ بر چو کرد لباس خلافت اکبر شاہ
بہ شرف و دولت واقبال و عزت و ناموس
سروش غیب زروی بدیہہ یک ناگاہ
جہیز عشرت پرویز گفت سال جلوس (۳۱)

۱+۱۲۲۰ = ۱۲۲۱ھ

مذکورہ بالا تاریخی قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی کا دربار سے تعلق تھا اور اکبر شاہ ثانی کے دربار میں عمل دخل تھا۔ اس کی توثیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے بڑے بھائی پیر بخش دربار سے تعلق رکھتے تھے اور اکبر شاہ ثانی کے دربار سے ان کو ''حکیم دوراں'' کا خطاب بھی ملا تھا۔

اکبر شاہ ثانی جب ۲۸ر جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ / ۲۸ر ستمبر ۱۸۳۷ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، تو ان کے صاحبزادے مرزا ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اس موقعہ پر صہبائی نے قطعہ تاریخ کہا ۔

از نشۂ دولت بہادر شاہی شد پر زمی طرب ایاغ دہلی
بنشست بہ تخت دولت روز افزوں نزہت بفزدد ازو دماغ دہلی؟
تاریخ جلوس آن شہہ والا قدر آمد بہ لب خرد چراغ دہلی (۳۲)

۱۲۵۳ھ

یہ قطعہ تاریخ بھی ظاہر کرتا ہے کہ صہبائی کی رسائی بہادر شاہ تک تھی اور ان

کے دربار میں باریابی ہوتی تھی۔ "ریزہ جواہر" جو صہبائی نے "سہ نثر ظہوری" کے طرز پر لکھا ہے اس میں انہوں نے بہادر شاہ ظفر کی مداحی اور شاگردی میں قلم کا زور دکھایا ہے۔ اس تفصیل سے اس امر کا اشارہ ملتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے صہبائی کا تعلق تھا۔

اس کے علاوہ "رسالہ نادرہ" کے اخیر میں ایک قصیدہ ملتا ہے جو مرزا فتح الملک بہادر ولی عہد شاہ دہلی کی شان میں ہے۔ قصیدہ کا انداز یہ بتاتا ہے کہ صہبائی کو ولی عہد کی سرکار میں بھی رسائی حاصل تھی۔ اس قصیدہ میں ولی عہد کے کرم واحسان کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں

آنچہ با من کردہ از مہر در عالم نکرد　　　در حق یک ذرہ ہرگز مہربان آفتاب (۳۳)

ملازمت

دہلی کالج میں استاد مقرر ہونے سے قبل صہبائی کا کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا۔ ابتدا میں بعض امیر گھرانوں میں مدرسی اور اتالیقی کے فرائض انجام دیتے رہے (۳۴)۔ جب ان کی محنت و لگن اور ان کی فارسی دانی کی شہرت ہوئی تو بعض امیروں کی توجہ ان کی طرف ہوئی اور انہوں نے اپنے لڑکوں کی تعلیم و تعلم کے لئے انہیں کا انتخاب کیا۔ چنانچہ کڑوالوں میں اور بعض متمول کشمیریوں میں چند جاے متفرق ان کے وقت تقسیم ہوئے۔ رفتہ رفتہ نواب حامد علی خاں کے لڑکوں کی تعلیم کے لئے مامور ہو گئے (۳۵)۔ "اور جب مستقل ذریعہ معاش کا کوئی سبیل پیدا نہیں ہوا تو مجبوراً ان کو ۱۲۴۸ھ / ۳۳-۱۸۳۲ء میں دہلی کو خیر آباد کہنا پڑا۔ "شرح نصیرای ہمدانی" کے خاتمہ میں لکھتے ہیں:

"۱۲۴۸ھ میں اس رسالے کو مکمل ہوئے ایک سال ہو چکا تھا اور صہبائی کو اس کا دل گلستان فراغت میں لے گیا تھا کہ یکا یک فکر معاش

نے اس کا دامن اختیار کھینچا۔ چنانچہ اس نے گوشہ عافیت سے پاؤں باہر نکالا، جو راحت زندگی کو غنیمت جاننے والوں کی جائے پناہ ہوتا ہے۔ دل کو تکالیف سفر اٹھانے پر آمادہ کیا اور شاہجہاں آباد (دہلی) کی خاک پاک سے جدا ہوتے نالہ کناں ہوا۔ آخر وقت کے تقاضے سے سرزمین "مین پوری" میں وارد ہوا اور غریب الوطنی میں مبتلا ہونے کی صعوبت سے اور بالخصوص اس خطہ کے لوگوں کی بے اعتنائی سے نظم ونثر کے خیالات ذہن سے نکل گئے۔" (۳۶)

"مین پوری" میں ان کے شب و روز کس پریشانی و مصیبت میں گذرے، اس کا اندازہ صہبائی کے اس خط سے ہوتا ہے، جو انہوں نے اپنے استاد مولوی عبداللہ خاں کو لکھا تھا:

"درین روزها که صحرای مین پوری چون دلهای محزون هر طرف رنگ صد کلفت ریخته است دور ساغر الطاف اگر بدادا این اضطراب نمی رسید بکدام بهانه از سر دل طپید نها باز می گردیدیم و بکدام حیله از بی قراری ها اضطراری انتقام می کشیدیم۔

دل زیادش از تطاولهای رنج آسوده نیست
بست فکر قامتش اندیشه فردائی ما

یارب وصول بزم حضور بساط طرب گستری های مهجوران آراید و بساغر پیمای ذوق وصال تکلیف مخموران دوری رفع نماید۔" (۳۷)

اس مجبوری، بے کسی اور تنہائی کے دور میں ایک امید کی کرن نظر آئی جب کسی شیخ کلو نے یہ مژدہ سنایا کہ نواب حیدر حسن خاں بہادر رئیس شاہجہاں آباد کے دربار میں طلبی ہونے والی ہے۔ صہبائی نے بڑی توقع و امید سے نواب صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا، جس کی نثر میں قصیدہ نگاری کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ صہبائی لکھتے ہیں:

"بشارت رسان بریدی بالب و زبان گوہر بار شیخ کلو نامی از زمرۂ حضار دربار جانی در قالب مردہ ء امید۔ اگر غلط نکنم مسیحائی بداد بیابان مرگیہای یاس در رسید کہ خار خشکی در حضرت ابر رحمت مطلوب باریابی ست و تشنہ لبی در درگاہ محیط دستوری یاب عرض نیاز تابی غنیمت شماری امید بہ بہانہ این بشارت سر گرم ترانہ سپاس گشت۔" (۳۸)

لیکن یہاں بھی صہبائی کا مقصد پورا نہ ہوا اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ صرف یہ اعزاز حاصل ہوا کہ نواب صاحب سے مراسلت ہونے لگی۔

یہاں ایک بات کھٹکتی ہے کہ جب صہبائی کے بھائی پیر بخش اور خود صہبائی کی رسائی دربار میں تھی تو آخر اس معاشی تنگ حالی میں کیوں مبتلا تھے۔ اس کا کوئی ٹھوس حل پیش کرنا تو مشکل ہے البتہ قیاساً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگرچہ ان کی رسائی دربار میں تھی لیکن داد و دہش میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا اور ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں ہندستانی بادشاہ خود انگریزوں کے رحم و کرم پر تھے اور ان کو انگریزوں کی طرف سے ایک مقرر وظیفہ ملتا تھا، جس سے خود ان کی ضروریات زندگی پوری نہ ہوتی تھی تو دوسروں کو کیا نوازتے۔

غرض دلی کو خیر آباد کہنے اور غریب الوطنی کے مصائب اور شدائد جھیلنے اور کافی تگ و دو کرنے کے باوجود بھی صہبائی کو کچھ حاصل نہیں ہوا تو مجبوراً اپنے وطن مالوف واپس آنا پڑا۔ تلاش معاش کی طرف سے ان کی بے فکری اس وقت دور ہوئی جب وہ دہلی کالج میں استاد مقرر کیے گیے۔ دہلی کالج میں ان کا تقرر کس سال ہوا۔ اس بارے میں تذکرہ نگاروں کے مابین اختلاف رائے ہے۔

مولوی کریم الدین (۳۹) اور مولوی عبدالحق (۴۰) کے مطابق صہبائی کا تقرر دہلی کالج میں ۱۸۴۰ء میں ہوا تھا۔ اور مولانا ضیاء احمد بدایونی (۴۱) نے بھی اسی رائے کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے برعکس محمد حسین آزاد (۴۲) اور ڈاکٹر خواجہ محمد حامد (۴۳) کی

رائے میں ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کے حلقہ مدرسین میں داخل ہوئے۔

چونکہ معتبر اور مستند تذکروں میں ۱۸۴۲ء کا تذکرہ نہیں ملتا ہے اور مولوی کریم الدین اور مولوی عبدالحق نے جو تقرر کا سال بتایا ہے، وہ محمد حسین آزاد کے مقابلے میں کئی وجہوں سے زیادہ قابل قبول ہے۔ چنانچہ یہ اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سال تقرر ۱۸۴۰ء ہی ہے۔

دہلی کالج ایک سدا بہار کالج تھا، جہاں سے ماسٹر رام چندر، شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلما محمد حسین آزاد، شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ، شمس العلما ضیاء الدین، مسٹر پیتمبر، موتی لال دہلوی، بھیرو پرشاد، پنڈت من پھول، ماسٹر پیارے لال، سری رام، حکم چند، نند کشور، ماسٹر کیدار ناتھ، پیرزادہ محمد حسین، خواجہ محمد شفیع اور مولوی کریم الدین جیسی نامور، قد آور اور عبقری شخصیت پیدا ہوئی، جس نے اپنے فیض و کرم سے ملک میں علم کی ضیا پاشی اور تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا، جس سے بہتر کوئی اور ہمارے ملک کے حق نہیں ہو سکتا۔

دہلی کالج بننے سے قبل یہ غازی الدین کے مدرسہ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ مدرسہ ۱۷۹۲ء میں وجود میں آیا۔ پھر اس مدرسہ کو انگریزوں نے ۱۸۲۵ء میں کالج میں تبدیل کر دیا۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> "دہلی کالج ابتداءً مدرسہ غازی الدین کے نام سے مشہور تھا۔ اس مدرسہ کی ابتدا ۱۷۹۲ء میں ہوئی اور ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا۔" (۴۴)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی "کلیات شاہ نصیر" کے مقدمہ میں اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

> "دہلی کالج کا قیام ۱۲۴۱۔۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں عمل میں آیا۔ جب غازی الدین خاں کے قدیم مدرسہ کو انگریزی سرکار نے نئی تعلیم کے لئے منتخب

کیا۔"(۴۵)

اس کالج سے ہندستان اور اہل ہندستان کو کیا فائدہ پہنچا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"دہلی کالج کا پھل اس کے وہ سپوت ہیں جنہوں نے علم کے اس نور سے، جوان کے سینوں میں مشتعل تھا، اپنے ملک اور اپنی زبان کو جگمگا دیا۔ علم کے وہ پجاری آج ہماری زبان کے دیوتا ہیں... ان کے نام ہی اس بات کے سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ دلی کالج کیا چیز تھا اور اس نے کیا کام کیا۔"(۴۶)

دہلی کالج میں صہبائی کا فارسی استاد کی حیثیت سے تقرر کا ایک عجیب واقعہ نقل کیا جاتا ہے، جس کو صہبائی پر لکھنے والوں کی اکثریت نے اپنے تذکروں میں تحریر کیا ہے۔ لیکن دراصل اس واقعہ کا ماخذ مولوی کریم الدین کا تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" ہے۔ یہاں "آب حیات" سے یہ واقعہ نقل کیا جاتا ہے تاکہ اس واقعہ پر محمد حسین آزاد نے جو ملمع سازی اور رنگ آمیزی کی ہے، وہ سامنے آسکے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب، جو کئی سال تک اضلاع شمال مغرب کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے، اس وقت سکریٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دہلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپے مہینے کا ایک مدرس عربی ہے ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ ان میں مرزا کا بھی نام آیا۔ مرزا حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کے حسب دستور قدیم صاحب سکریٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جب کہ وہ نہ ادھر سے آئے نہ یہ ادھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سکریٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ

پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے؟ انہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیونکر جاتا؟ جمعدار نے جاکر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں۔ اس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں۔ صاحب نے فرمایا ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے گئے۔ صاحب موصوف نے مومن خاں کو بلایا۔ ان سے کتاب پڑھوا کر سنی اور زبانی باتیں کر کے اسی (۸۰) روپے تنخواہ قرار دی۔ انہوں نے سو(۱۰۰) روپے سے کم منظور نہ کئے۔" (۴۷)

مومن خاں کے انکار کرنے پر امام بخش صہبائی نے دہلی کالج کی خدمت چالیس روپے ماہانہ پر قبول کرلی جو بعد کو پچاس ہو گئے، مومن کو اسی روپے ماہوار اور اسی عہدے پر صہبائی کو ۴۰ روپے کیوں دیا گیا۔ اس پر رام بابو سکسینہ کی تحریر سے کچھ روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

"ٹامسن صاحب نے یہی جگہ بمشاہرہ اسی روپے ماہوار اس شرط پر کہ باہر جائیں مومن خاں کو دینا چاہی مگر انہوں نے باہر جانے سے انکار کیا(۴۸)۔"

اور چونکہ صہبائی کے ساتھ غالباً باہر جانے کی شرط نہیں رکھی گئی اس لیے انہوں نے چالیس روپے ماہوار لینا گوارہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ فارسی کے مدرس اول کے عہدہ پر فائز ہو گئے، جس پر وہ تادم آخر قائم رہے۔ گویا ۱۸ سالوں تک وہ دہلی کالج کی خدمت انجام دیتے رہے اور دوران ملازمت ہی ۱۸۵۷ء میں انگریز کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ ملازمت سے قبل جو مشکلات تھیں وہ اب دور ہوئیں اور یوروپین پرنسپل کی

صحبت کے فیض سے ان کی نظر کی گہرائی اور گیرائی اور معلومات میں مزید پہنائی پیدا ہوئی۔

روز و شب کے معمولات

صہبائی کے زمانے میں دہلی بڑے بڑے علما، فضلا، حکما، ادبا اور شعرا کا مرکز اور گہوارہ تھی۔ اس زمانے میں دیوان خانوں کا عام رواج تھا جہاں دوست احباب کی مستقل نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ دہلی کے اس وقت کے دیوان خانوں میں مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ کا دیوان خانہ کافی مشہور تھا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے ہاں عصر کے بعد صاحب علم و فن کی محفل بجتی تھی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے ہاں عشاء بعد ذی علم حضرات کی صحبت رہا کرتی تھی۔ ان دیوان خانوں میں علمی مباحث اور شعر و ادب کے مذاکرے ہوا کرتے تھے۔ ان دیوان خانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> "والد مرحوم دہلی کے دیوان خانوں کی مجلس کے جو افسانے سنایا کرتے تھے، بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھا۔ مفتی صاحب کا دیوان دہلی کے منتخب کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات کوئی موسم ہو، لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی نو وارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک مجلس دیکھ سکیں، وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانے کا رخ کرتا۔" (۴۹)

مولانا آزاد کے والد جب ان دیوان خانوں کی نشستوں کا ذکر کرتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے اور آبدیدہ ہو جاتے۔

تمتع من شمیم عرار نجد   فما بعد العشیة من عرار (۵۰)

مولانا صدر الدین آزردہ کے دیوان خانے کا ذکر کرتے ہوئے سر سید لکھتے ہیں:

"یہ باتیں تو ایسی صحبتوں کی یادگار ہیں، جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کجا وہ صحبتیں اور کہاں وہ علما، صرف یاد ہی یاد ہے۔" (۵۱)

اگرچہ صہبائی کی زندگی گوناگوں مصروفیتوں اور مشغولیتوں سے پُر تھی لیکن برابر ان دونوں مجلسوں کو رونق بخشتے تھے۔ چنانچہ خانگی ضرورت، کالج کی مصروفیات، سماجی مشغولیات اور تصنیفی اور تالیفی کاموں کے باوجود وہ ان دونوں دیوان خانوں میں حاضر ہوا کرتے تھے اور کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ جب صہبائی کالج سے لوٹتے تو شام کو ہوا خوری کے بجائے مولانا فضل حق خیر آبادی کے یہاں جاتے اور شب میں بعد نماز عشا مفتی صدر الدین آزردہ کے یہاں موجود ہوتے تھے۔ یہی صہبائی کے روز و شب کے معمولات تھے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان صحبتوں کے رکن ایک حضرت صہبائی بھی تھے۔ کالج سے لوٹتے، گھر آتے، پھر شام کو ہوا خوری کے بجائے مولانا فضل حق خیر آبادی کے یہاں جاتے، وہاں سے پہری فواکہات کھاتے، شب میں بعد نماز عشا مفتی صاحب کے یہاں جاتے۔ یہاں کی محفل برخاست ہوتی، گھر جاکر سو رہتے۔" (۵۲)

اخلاق واطوار

صہبائی کی شخصیت میں بڑی دل آویزی اور کشش تھی۔ وہ صدق و صفا کا مظہر اور عقل و خرد کا پیکر تھے۔ حلم و بردباری کے صفات سے آراستہ اور علم و ادب کے زیور سے پیراستہ تھے۔ ہجو گوئی اور عیب جوئی سے کوسوں دور تھے۔ آئین شرفا کے مطابق خوش خلقی اور وضعداری معمول میں داخل تھی۔ انصاف پسندی اور صلح کل کے مسلک پر چلتے تھے۔ یہی وہ صفات و خصائل تھے، جن کی وجہ سے صہبائی سبھوں کی آنکھوں کا

تار ابنے ہوئے تھے اور ہندو مسلم سب ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

امام بخش صہبائی دین دار آدمی تھے اور مذہبی و دینی احکام کو بجا لانے میں کسی خطرہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اور نماز جماعت سے ادا کرتے تھے اور اس میں کبھی کوتاہی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے ہولناک ہنگامے میں بھی مسجد میں نماز پڑھنا ترک نہیں کیا۔

صہبائی کی زندگی کا ایک بڑا حصہ عسرت اور مفلسی میں گذرا۔ وہ اپنی پریشان حالی اور تنگ دستی کو جبہ و دستار میں چھپائے رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ بقول گارساں دتاسی "پرانی وضع کا لباس پہنتے تھے (۵۳)۔" مرزا فرحت اللہ بیگ ان کے لباس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سر پر چھٹے ہیں، بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں---ایک برکا سفید پاجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جبہ پہنتے ہیں اور سر پر چھوٹا سا سفید صافہ باندھتے ہیں۔" (۵۴)

یہی صوفیانہ وضع تادم حیات برقرار رہی۔ کھیل تماشوں کا ان کو کوئی شوق نہیں تھا۔ کیونکہ ان کا ایک ضابطہ حیات تھا، جس کو پورا کرنے کے بعد ان کو وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ کھیل تماشوں میں وقت دیں۔

صہبائی جیسے صاحب علم و فضل تھے، ویسے ہی صاحب عمل بھی تھے، کالج کی مصروفیات، سماجی مشغولیات اور خانگی ضروریات کو پورا کرنے کے باوجود تصنیف و تالیف کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ وہ علم دوست ہونے کے ساتھ ساتھ زندہ دل انسان بھی تھے۔ وسیع النظر اور وسیع المشرب ایسے تھے کہ ہندو مسلم سب سے یکساں میل جول تھا اور سب سے یکساں مہر و محبت سے ملتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سب ان کے گن گاتے تھے۔

اعزا و اقربا

امام بخش صہبائی جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ خاندان اپنی وجاہت اور علم و فضل کی حیثیت سے مشہور تھا اور علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ صہبائی کے والد محمد بخش تھانیسری خود علم دوست، بیدار مغز اور مذہب پسند تھے اور اسی قسم کے لوگوں کو پسند کرتے تھے۔ ان کی والدہ قادریہ خاندان سے تھیں۔

مولانا محمد بخش تھانیسری کے دو لڑکے تھے۔ ایک لڑکے کا نام حکیم پیر بخش تھا اور دوسرے لڑکے کا نام امام بخش صہبائیؔ تھا۔ اور دو بیٹیاں بھی تھیں۔ ایک بیٹی کے بطن سے اکرام الدین اور وزیر الدین اور دوسری بیٹی کے بطن سے مولوی قادر علی پیدا ہوئے۔

حکیم پیر بخش علم و ادب کے زیور سے آراستہ تھے۔ اور ان کا تعلق اکبر شاہ ثانی کے دربار سے تھا۔ جہاں سے ان کو "حکیم دوراں" کا خطاب ملا تھا (۵۵)۔ پیر بخش کے لڑکے محمد عبدالحکیم بسملؔ تھے (۵۶)۔ اور نواسے محمد یعقوب نسیمؔ ولد حافظ غلام احمد نکہتؔ تھے (۵۷)۔ ان کے علاوہ دیگر رشتہ داروں میں رحمت علی، حافظ فردوس علی خلشؔ، اکرام الدین رند، مولوی رحیم بخش طربؔ وغیرہ تھے (۵۸)۔ رند کا تذکرہ کرتے ہوئے مرزا قادر بخش صابر نے لکھا ہے:

> "رندؔ تخلص ہے، نوجوان سعادت مند اکرام الدین نام کا کہ مولوی عبدالعزیز عزیزؔ اور مولوی عبدالکریم سوزؔ صاحبزادگان حضرت استادی کا ماموں زاد بھائی ہے (۵۹)"۔

یہ وہی رندؔ ہے جس کی پھوپھی سے صہبائیؔ کی شادی ہوئی تھی (۶۰)۔

مولوی رحیم بخش طربؔ کے بارے میں ناسخؔ نے لکھا ہے:

> "طربؔ تخلص مولوی رحیم بخش نواسہ شیخ نور محمد قادری تھانیسری

مقیم دہلی شاگرد عبدالکریم سوزؔ۔" (۶۱)

اور لالہ سری رام نے لکھا ہے:

"کتب فارسی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھی تھیں۔ فن شعر میں عبدالکریم سوزؔ سے تلمذ تھا۔ غدر کے بعد زندہ تھے اور طبابت کے ذریعہ بسر اوقات کرتے تھے"۔ (۶۲)

تذکروں سے امام بخش صہبائی کے تین بھانجوں کا پتا چلتا ہے یعنی اکرام الدین رندؔ، وزیرالدین اور قادر علی۔ ڈاکٹر انصار اللہ لکھتے ہیں:

"دونوں (وزیرالدین، قادر علی) کے ناموں میں جو فرق ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی ہوں گے۔ بظاہر وزیرالدین، صہبائیؔ کے ایک دوسرے بھانجے اکرام الدین رندؔ کے بھائی ہوں گے۔ ان قیاسوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد بخش تھانیسری کے دو بیٹوں پیر بخش اور امام بخش کے علاوہ دو بیٹیاں بھی تھیں۔ ایک بیٹی کی اولاد میں اکرام الدین رند اور وزیرالدین تھے اور دوسری کی اولاد میں مولوی قادر علی تھے"۔ (۶۳)

مولوی قادر علی کا ذکر علامہ راشد الخیری نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ (۶۴)

مختلف تذکروں اور خود صہبائی کی تصانیف کی ورق گردانی کے بعد پتا چلتا ہے کہ صہبائیؔ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ صہبائیؔ نے اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھانجے وزیر الدین کے ساتھ کی تھی، جن کے ایک فرزند کا نام محمد حمید الدین تھا۔ اس کا انکشاف حمیدالدین کے اس خط سے ہوتا ہے، جو انہوں نے سرسید کو لکھا تھا (۶۵)

صہبائیؔ اپنے دونوں بیٹوں عبدالعزیز عزیزؔ اور عبدالکریم سوزؔ کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی تھی اور بہت کوشش و لگن سے ان دونوں کو تعلیم دلائی تھی۔ انہیں کی تربیت کے پیش نظر شرح نویسی کے خارزار میدان میں

قدم رکھا تھا۔ "شرح مینا بازار" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"درین روزگار اندیشہ تربیت فرزندان دل بندم عبدالعزیز و عبدالکریم طال عمر حما کہ دلم را عزیز تراز جان و چشم را گرامی تراز مردمک اند، دامن شوق گرفت و خواہی نخواہی برین آورد کہ قلم را در دست گرفتم و کاغذ را مہرہ کشیدہ مرکب تازہ در دوات کردم۔" (۶۶)

صہبائی نے اپنے لخت جگر کی تعلیم و تربیت میں جو عرق ریزی و جگر سوزی کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں بیٹے ذی علم ہوئے اور شاعری میں نامور ہوئے۔ تمام تذکرہ نگاران کی خوبیوں اور صلاحیتوں کے معترف نظر آتے ہیں۔ بڑے لڑکے عبدالعزیز کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لالہ سری رام نے تحریر کیا ہے:

"عزیز مولوی عبدالعزیز مہین پور مولانا امام بخش صہبائی، علمی استعداد معقول تھی۔ فن سخن میں اپنے پدر عالی قدر کے شاگرد تھے۔ ایام غدر میں ظفریاب لشکر کے ہاتھوں بے گناہ شہید ہوئے۔ طبیعت کا رنگ نرالا ہے۔ بہت پر لطف اور دل میں اتر جانے والے شعر کہتے تھے۔ خیالات میں باریکی ہے، زبان صاف ہے۔" (۶۷)

اور مرزا فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

"(عزیز کی) غزل سن کر استاد ذوق نے کہا بھئی صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحب زادے واہ کیا کہنا! ہے ہے دل خوش ہو گیا، کیوں نہ ہو، ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" (۶۸)

صہبائی کے دوسرے لڑکے عبدالکریم تھے، جن کا تخلص سوز تھا۔ ان کے بارے میں مرزا قادر بخش صابر نے لکھا ہے:

"سوز--- پسر حضرت استاد ہیں--- سال عمر اس نونہال چمنستان

کمال کے ہنوز انیس ہیں سے متجاوز نہیں ہوئے۔" (۶۹)

عبدالکریم سوز اپنے بڑے بھائی عبدالعزیز سے زیادہ ذہین اور فطین تھے۔ لالہ سری رام ان کے بڑے عقیدت مند تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سوز شاعر جادو مقال، ناثر عدیم المثال --- عربی فارسی میں صاحب تکمیل، منطق، حکمت اور دیگر علوم وفنون میں فارغ التحصیل۔" (۷۰)

صہبائی کا یہ علمی گھرانا غدر میں نیست و نابود ہو گیا اور دہلی کے ایک بے مثال خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ صہبائی کے شاگرد پنڈت دھرم نرائن نے اس دل سوز سانحہ پر اشک سوزی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آن تشنہ لب زلال آمرزش (صہبائی) باہردو فرزند جگر بند کہ دریای فضل را موج و کوکب سمای ہنر را اوج بودند۔ در سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت عیسوی چشم برروی ساقی کوثر کشادہ --- جہان ماتمی ایں بیداد و عالمی دل ریش این واقع حسرت ایجاد است۔" (۷۱)

تلامذہ

امام بخش صہبائی کی زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گزرا۔ شروع کے دنوں میں مستقل ملازمت نہ ہونے کی وجہ سے بطور ٹیوشن امیر و غریب کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اور جب دہلی کالج میں بحیثیت فارسی استاد پڑھانے پر مامور ہوئے تو تعلیم و تعلم ان کی لائف کا ایک حصہ بن گیا، جو شہادت کے وقت تک جاری رہا۔ اس دوران ہزاروں شاگردوں نے ان سے استفادہ کیا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ صہبائی کے شاگردوں پر بہت کم مواد ملتا ہے۔ حالانکہ صہبائی کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ البتہ بہت سارے ایسے ہیں، جن کے بارے میں معلومات فراہم نہیں ہیں۔ ابتدائی زمانے میں صہبائی نے جن لوگوں کو پڑھایا تھا، ان کے حالات تذکروں میں

محفوظ نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ دور خود صہبائی کی پریشانی کا دور تھا اور ان کے شاگرد غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور چند سال بعد جب ان کی لیاقت اور علمی مرتبے کا شہرہ ہوا تو چند متمول گھرانوں کے لڑکے بھی ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔

باقاعدہ طور پر درس و تدریس کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا، جب وہ دہلی کالج میں استاد مقرر کیے گیے۔ صہبائی کو درس و تدریس میں دستگاہ اور مہارت حاصل تھی۔ وہ طلبا میں بے حد مقبول تھے اور ان کے اکثر شاگرد علم و فضل میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

"(صہبائی) طلبا میں بے حد مقبول تھے۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ اکثر ایسے ہیں جنہوں نے فضیلت علمی کے ساتھ اچھے عہدے بھی حاصل کیے۔" (۷۲)

متعدد ماخذ اور مراجع کی ورق گردانی کے بعد صہبائی کے جن شاگردوں کا سراغ ملا ہے، اس کا ایک مختصر خاکہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:

آزاد، شمس العلما مولوی محمد حسین: "آب حیات"، "دربار اکبری"، "سخندان فارس" اور "نگارستان" کے مصنف اور صاحب طرز انشا پرداز شمس العلما محمد حسین آزاد کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اردو داں حضرات نے ان پر بہت کچھ لکھا ہے۔ حافظ محمود شیرانی اور محمد یحیی تنہا ان کو صہبائی کا شاگرد مانتے ہیں۔ شیرانی تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا آزاد، صہبائی سے جو ان کے استاد بھی ہوں گے، کسی وجہ سے خفا ہیں"۔ (۷۳)

اور محمد یحیی تنہا لکھتے ہیں:

"مولوی آزاد، ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ ان (صہبائی) کے شاگرد تھے۔" (۷۴)

آشوب، ماسٹر پیارے لال: ۱۸۳۸ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ راجہ ٹوڈرمل

سے ان کا خاندانی سلسلہ ملتا ہے۔ صہبائی، غالبؔ اور عبدالکریم سوزؔ سے تلمذ تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا۔ (۷۵)

آہیؔ، عبدالرحمٰن: میر حسین تسکینؔ کے صاحبزادے، اخلاق حمیدہ اور اطوار پسندیدہ سے پیراستہ، کتب درسیہ صہبائیؔ سے تمام و کمال پڑھیں، فن معما کو نہایت تحقیق و تدقیق سے حاصل کیا۔ شاعری بھی کرتے تھے

ہے غلط دھوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر
شہر میں چاک کسی کا تو گریباں ہوتا

کچھ تمہیں بھی خبر ہے آہیؔ کی
لوگ کہتے ہیں مر گئے کب کے (۷۶)

اثرؔ، عبدالرزاق: عبدالرحمان تمنّاؔ کے بیٹے، ذہین و فطین اور خوش اخلاق تھے۔ بہت دنوں تک شاہجہاں آباد میں امام بخش صہبائیؔ کی خدمت میں حاضر ہو کر فارسی پڑھی۔ علوم ریاضی کی تعلیم مدرسہ سرکار انگریزی میں حاصل کی۔ نہایت موزوں طبیعت کے مالک تھے۔ بہت لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ اردو شعر کہتے تھے

پہلو میں درد سینہ میں چاک اشک آنکھ میں
مجھ سے تو کہہ اثرؔ کہ ترا دل لگا کہیں

مجھے تو جلنے پہ بھی زندگی غنیمت تھی
فلک نے مثل چراغ اب بجھا دیا مجھ کو (۷۷)

اصغری (کرانی)، محبوب علی شاہ رمال و جفار: شیخ محمد بخش قادری کے فرزند ارجمند تھے۔ نعت گوئی میں مہارت تھی، اردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ امام بخش صہبائیؔ کے شاگرد تھے۔ (۷۸)

اوجؔ، لالہ جگل کشور: کایستھ خاندان سے تھے۔ شاہجہاں آباد وطن تھا۔ فارسی میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ببازارش نبردم زان متاع طاعت خودرا
کہ می بینم گران آنجا بہای جنس عصیان را

آن کیست کہ بازت کشداز راحت عاشق
تو خود نہ پسندیدۂ آرام دل ما(۷۹)

ایجادؔ، مرزا رحیم الدین: مرزا حسین بخش کے صاحبزادے، امام بخش صہبائیؔ اور مرزا قادر بخش صابرؔ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ صہبائیؔ ان پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے

بت خانہ میں تھا یا کہ میں کعبے کے قرین تھا
اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا

یہ کس خلش کا تقاضا رہا کہ تادمِ صبح
کچھ آپ بھی آپ رہی دل کو بیقراری رات (۸۰)

بسملؔ، نواب امیر حسن خاں: کلکتہ کے باشندے، صاحب ثروت تھے، ان کی زکوۃ سے گدائے محلہ صاحب نصاب بن گئے۔ مزاج میں مسکینی اور تواضع تھی۔ صہبائیؔ کے اوصاف وخصائل سن کر غائبانہ شاگردی کا سلسلہ قائم کیا اور خط وکتابت کے ذریعہ اسے مزید استوار کیا۔ ایک رقعہ بے نقط خدمت میں ارسال کیا۔ صاحب گلستان سخن نے لکھا ہے کہ چند سال ہوئے ہیں کہ دنیائے دوں سے دل اٹھا کر عالم آخرت کو راہی ہوا

لالہ راخلعت گلگون صلۂ یک داغ است
بہر من چیست کہ داغم زشمار افتادہ (۸۱)

بسملؔ، محمد عبد الکریم: خلف پیر بخش، برادر زادۂ امام بخش صہبائیؔ

مری بالیں پہ وقت نزع لاؤ ایک دم اس کو
رہے گا حشر تک سینے میں ورنہ داغ ارماں کا (۸۲)

بلبلؔ، پنڈت گوری شنکر: باشندۂ لاہور، شاہجہاں آباد میں وارد ہوئے، صہبائیؔ سے تلمذ، مرزا قادر بخش صابرؔ سے شناسائی، زباندانی میں اقران وامثال سے ممتاز تھے

اگر بچشم جہاں نیست عزتی غم را
چرا کنند سر سالہا محرم را (۸۳)

تسکینؔ، میر حسین: اہل ثروت اور متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ مومنؔ اور صہبائیؔ سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ صہبائیؔ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور دوست کہہ کر پکارتے تھے۔ ''ترجمہ حدائق البلاغت'' میں لکھتے ہیں:

''اس قبیل سے یہ شعر میر حسین تسکینؔ کا کہ راقم کے دوستوں میں سے ہے۔

اب یہ حالت ہے کہ ان سا بے درد میرے بچنے کی دعا مانگے ہے (۸۴)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ اپنے تذکرہ میں تسکینؔ کا حال بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سلسلہ نسبش بہ میر حیدر خاں قاتل پسر فرخ سیر می رسید، صاحب فکر بلند و اسلوب گفتارش دل پسند، از حضرت مومنؔ بدرستی اشعار پرداختہ، از احباب راقم است۔'' (۸۵)

تسکینؔ کی تعلیم کہاں ہوئی اور کن کن اساتذہ سے انہوں نے کسب فیض کیا۔ شیفتہؔ نے اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ البتہ ''گلستان سخن'' میں اس کی نشاندہی یوں کی گئی ہے:

''کتب فارسی کو جناب استاذی امام بخش صہبائیؔ سے پڑھا ہے۔'' (۸۶)

تسکینؔ اردو میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے

رہنے والوں کو ترے کوچے کے یہ کیا ہو گیا
میرے آتے ہی یہاں ہنگامہ برپا ہو گیا
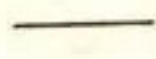
یہ کہہ کے شب ہجر میں کرتا ہوں تسلی
جو رنج و مصیبت ہے سو انساں کے لئے ہے

تمناؔ، عبدالرحمٰن: قصبہ جے پور کے قاضی زادوں میں سے تھے۔ مولوی محمد حسین ہجرؔ ان کے حقیقی بھائی تھے۔ صہبائیؔ سے مدت مدید تک تحصیل علم کی۔ فارسی میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے اور مولانا صہبائیؔ سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ان کی زبان بہت خوش اسلوب اور طبیعت نہایت سلیم تھی۔

این قدر آشفتگی ہر دم چرا بودی مرا   آشنا گر آن بت نا آشنا بودی مرا (۸۷)

حسرتؔ، منولال: کایستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد لالہ پیارے لال محکمہ عدالت دیوانی انگریزی میں وکالت کرتے تھے۔ شاہجہاں آباد کے ہونہار نوجوانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، کتب فارسیہ کی تحصیل اور شعر فارسی کی اصلاح بھی صہبائیؔ سے لیا کرتے تھے

کردیم در خزانۂ دل جمع نقد داغ
لالہ برد زکوۃ زر بی حساب ما
آتشِ دل ھمچو اخگر می کند خاکسترم
گرد این کلفت بہر دم زندہ در گورم کند (۸۸)

حسن علی، سید: تذکرۂ کاملان رامپور کے مصنف نے مولوی سعیدالدین محمد مجتبیٰ خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے سید حسن علی شاگرد صہبائیؔ سے کسب فیض کیا تھا۔ (الف)

حیرت، حافظ عبدالرحمٰن: جھنجھانہ وطن تھا۔ شرفائے عظام اور نجبائے کرام میں شمار ہوتا تھا۔ کتب درسیہ کی تحصیل اور ریختہ کی اصلاح صہبائی سے لیا کرتے تھے

لخت جگر رکا ہے آنکھوں میں آکے ورنہ
طوفاں اٹھائے میری چشم پر آب کیا کیا
کچھ دل میں بے کلی ہے کچھ ہے جگر میں سوزش
ہیں عشق کی بدولت مجھ پر عذاب کیا کیا (۸۹)

پنڈت دھرم نراین: ۱۸۲۵ء کے آس پاس کی ولادت ہوگی۔ بشن نرائن ان کے والد تھے۔ یہ بہت ہی ذہین اور فطین تھے۔ کئی کتابوں کا انہوں نے ترجمہ کیا۔ صہبائی کی کتاب ''قول فیصل'' کو ۱۲۷۸ھ میں مطبع کانپور سے شائع کیا۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''صہبائی کا ''قول فیصل'' ان کے شاگرد پنڈت دھرم نرائن میر منشی اجنٹی مالوہ ۱۲۷۸ھ میں مطبع کانپور سے شائع کرتے ہیں۔ (۹۰)

پنڈت دھرم نرائن اپنے استاد مکرم صہبائی کی بہت ہی عزت اور توقیر کرتے تھے۔ اور اپنے استاد کے علمی کارناموں کو دنیا کے سامنے لانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح منشی دین دیال تصانیف صہبائی کو زندہ و جاوید بنانے کے لئے کوشاں تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے اس استاد پرستی پر بہت ہی عقیدت اور احترام سے ان کو یاد کیا ہے:

''آفریں ہے پنڈت جی کی استاد پرستی پر کہ سرکاری پولیٹکل خدمت پر سرفراز ہونے کے باوجود غدر سے پانچ سال بعد مرحوم (صہبائی) کے فرزندان معنوی کو زندہ جاوید بنانے میں مصروف تھے۔'' (۹۱)

پنڈٹ دھرم نراین کا تعارف کراتے ہوئے مولوی کریم الدین تحریر کرتے ہیں:

"بہت خلیق اور باادب اور عقلمند اور ہوشیار اور چالاک اور تیز اور ذہین آدمی ہے۔ اس نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ایک پولیٹکل اکونومی کا اردو میں اور کچھ تاریخ انگلستان کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ وہ دونوں چھپ گئے ہیں۔ درمیان ۱۸۴۷ء کے عمر اس کی قریب ۲۲، ۲۳ برس کی ہے۔" (۹۲)

صہبائی اور پنڈت دھرم نراین کے تعلقات کافی خوشگوار تھے۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت ہوتی تھی۔ "کلیات صہبائی" میں صہبائی کے تین خطوط پنڈت دھرم نراین کے نام ہیں۔

منشی دین دیال: صہبائی کے چند ممتاز ترین شاگردوں میں منشی دین دیال میر منشی اجنٹی بھوپال کا شمار ہوتا ہے۔ دونوں میں دوستانہ تعلقات تھے۔ صہبائی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور منشی دین دیال بھی صہبائی کی عزت و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ منشی دین دیال کے نام صہبائی کے ۱۶ خطوط "کلیات صہبائی" میں ملتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب منشی دین دیال نے استاد کی خدمت میں ایک مخمل کی ٹوپی بھیجی تو صہبائی شاگرد سے یہ تحفہ پاکر بہت خوش ہوئے اور اس ٹوپی کو تاج کا درجہ دیا۔ اپنے اس عمل سے صہبائی نے شاگرد نوازی کی ایک عمدہ مثال قائم کی ہے۔

جس زمانے میں فارسی کا چلن کم ہو رہا تھا اور اردو، انگریزی کی تعلیم پر زور صرف کیا جا رہا تھا۔ اس زمانے میں منشی دین دیال نے بڑی کدوکاوش اور زرِ کثیر صرف کر کے صہبائی کی نثر و نظم کی ترتیب و تدوین کا بیڑا اٹھایا اور انتھک کوشش سے "کلیات صہبائی" کے نام سے تین جلدوں میں ان کی نثر و نظم کو جمع کر کے شائع کیا۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

"ان (صہبائی) کا کلیات ایک اور شاگرد منشی دین دیال میر منشی اجنٹی بھوپال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں مطبع نظامی سے تین ضخیم جلدوں میں

چھپواتے ہیں۔" (۹۳)

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ: ۱۸۳۰ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ کتب درسیہ کی تحصیل امام بخش صہبائی سے کی۔ ۱۸۵۱ء میں سرکاری ملازمت سے منسلک ہوگئے، سر رشتہ تعلیم میں پروفیسر رہے۔ متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں، جن کی تعداد ۱۵۰ کے قریب ہے۔ ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا۔ (۹۴)

رحمت، رحمت علی: صہبائی سے قرابت داری تھی اور انہیں سے تلمذ کا شرف بھی حاصل ہے۔ فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے۔ ان کے اشعار دل کش اور رنگین ہوتے ہیں۔ فارسی نثر بھی نہایت دلچسپ اور متین ہے۔ "حدیقہ رحمت" کے نام سے ان کی ایک تصنیف یادگار ہے، جو ان کی انشا پردازی کی خوبی کو ظاہر کرتی ہے۔ "شکایت فلک" کے نام سے ایک مثنوی ریختہ میں ملتی ہے۔ زبان کی شستگی اور عبارت کی سادگی سے ان کا کلام مملو نظر آتا ہے ؎

ساقی بریز درقدح من شراب را
دستی بگردن افگن وافگن نقاب را

ہنستے تھے کل جو حال پہ میرے سو آج میں
روتا ہوں ان کے دیکھ کے حال خراب کو (۹۵)

رحیم، مرزا رحیم بیگ: مرزا پیر بیگ کے لڑکے، وطن اصلی شاہ جہاں آباد، مولد ومنشا سر دھنہ ہے۔ ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء میں میرٹھ میں وارد ہو کر حکیم بو علی خان کی خدمت میں تحصیل کمال کا ارادہ کیا۔ موصوف نے ان کی قابلیت اور اہلیت کو دیکھتے ہوئے اپنی فرزندی میں لیا اور شفقت پدری سے فرزند حقیقی سے زیادہ تربیت دیا۔ ۱۲۶۰ھ میں زبدۂ ارباب کمال مولوی محمد بخش ناداںؔ کے تلمذ سے مشرف ہوئے اور اپنے سابقہ تخلص شررؔ کو ترک کر ان کے ایما پر رحیمؔ تخلص رکھ لیا۔ صہبائیؔ سے بالواسطہ

تلمذ کا امتیاز گرچہ حاصل نہ تھا لیکن بغرض اصلاح وہ اپنی نگارشات اور کاوشات کو ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے

ساقی بیا کہ گشتہ سر لالہ زار سبز
بر سبز و بحر سبز و لب جوئبار سبز

دوں میں کس کس کو کہ اک جان کے خواہاں ہیں بہت
غم جدا ، فکر جدا، درد جدا ، یار جدا (۹۶)

رفعت ، مرزا پیارے : سلاطین زادے ہیں۔ ۱۲۴۱ھ میں اس دار فنا میں قدم رکھا۔ طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ پہلے حافظ عبدالرحمٰن احسانؔ سے اصلاح سخن لیا کرتے تھے۔ بعد میں صہبائیؔ کے حلقہ شاگرداں میں شامل ہوگئے۔ غدر کے بعد انگریز کے ہاتھوں مارے گئے۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں:

"صاحب دیوان تھے۔ غدر کے بعد الور سے جو شاہزادے گرفتار ہو کر آئے ان میں یہ بھی تھے۔ نشانہ تفنگ اجل ہوئے۔ (۹۷)

اور مرزا فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

"یہ سلاطین زادے ہیں، بٹیریں لڑانے کا بڑا شوق ہے۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی خوب ہیں --- کوئی چالیس کی عمر ہوگی۔" (۹۸)

اشعار ملاحظہ ہوں

میں تجھ کو نہ کہتا تھا حسینوں کو نہ دے دل
رفعتؔ کوئی ان لوگوں سے جانبر نہیں ہوتا

آج کچھ رفعتؔ دل خستہ کا احوال ہے غیر
جو کہ دھڑکا تھا سو وہ پیش نظر آہی گیا (۹۹)

زارؔ، حافظ امام بخش: تھانیسر کے رہنے والے تھے۔ ولادت کے چھ ماہ بعد چیچک سے بینائی جاتی رہی۔ لیکن خدا نے ظاہر بیں آنکھ کے بدلے دیدۂ دل کو روشن کر دیا تھا۔ ہر ایک کا فیض اس طرح سے اخذ کیا کہ کاملین فن ان کی ذات کو مغتنم جاننے لگے۔ علم موسیقی کے دقائق سے واقفیت تھی۔ صہبائیؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۲۷۰ھ میں عالم فانی سے رحلت فرما گئے۔ شاعری بھی کرتے تھے

دکھلاؤں چارہ گر کو جو زخم جگر تو وہ
رو رو کے یوں کہے ہے کہ اس کا نہیں علاج

نہ تو آنکھوں میں خواب آتی ہے
اور نہ کچھ دل میں تاب آتی ہے (۱۰۰)

سحرؔ، احمد علی خاں: کرم علی خاں کے لخت جگر، شیریں زبان اور شیریں مقال تھے۔ فارسی کتب کی تحصیل صہبائیؔ سے کی۔ شاعری کرتے تھے لیکن اظہار سخن کم تر وقوع میں آتا تھا۔ البتہ جو کہا ہے بامزہ اور لذیذ کہا ہے۔ شاعری میں اصلاح نہیں لیتے تھے

تسخیر نہ ہوں کیونکر سحرؔ اپنے یہ آتش رخ
سیکھا ہے فسوں ہم نے اس نرگس فتاں سے

ہوئے زخمی مژہ کے اور نگاہ چشم دلبر کے
نہیں محتاج ہم نوک سناں و آب خنجر کے (۱۰۱)

پنڈت سروپ نارائن: پنڈت دھرم نرائن کے چھوٹے بھائی تھے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نے ان کو صہبائیؔ کا شاگرد بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"محمد حسین ہجرؔ نے "قول فیصل" کی منظوم تقریظ میں ان کا نام لیا ہے۔

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی صہبائی کے شاگردوں میں تھے۔" (۱۰۲)

سوز، عبدالکریم: صہبائی کے خلف رشید تھے۔ ان کے بارے میں مرزا قادر بخش صابر نے لکھا ہے:

"سال عمر اس نو نہال چمنستان کمال کے ہنوز انیس بیس سے متجاوز نہیں ہوئے لیکن کشور فضل و کمال کی منازل ہزار سے زیادہ طے کی ہیں۔" (۱۰۳)

عبدالکریم سوز اپنے بڑے بھائی عبدالعزیز عزیز سے زیادہ ذہین اور فطین تھے۔ لالہ سری رام ان کے بڑے عقیدت مند تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سوز شاعر جادو مقال، ناثر عدیم المثال --- عربی فارسی میں صاحب تکمیل، منطق، حکمت اور دیگر علوم و فنون میں فارغ التحصیل" (۱۰۴)

ہنگامہ غدر ۱۸۵۷ء میں اپنے والد اور بھائی کے ساتھ انگریز کی گولیوں سے مارے گئے۔ شاعری کرتے تھے اور خوب کرتے تھے

ہوتے ہی ہوگا اثر اس نالہ شبگیر کا
راہ پر آنا کوئی آساں ہے چرخ پیر کا
جان کو راہ فنا میں ہوگیا چلنا محال
ہلکہ ہر ہر گام ہے کشتہ تری شمشیر کا (۱۰۵)

شاد، میر یار خاں: ساکن میرٹھ، انگریزی پلٹن میں علاقہ منشی گری پر مامور تھے۔ خوش خلق، پسندیدہ اطوار، ذہین اور تیز طبع تھے۔ صہبائی کی خدمت میں ایک دفعہ صاحب گلستان سخن سے ملاقات ہوئی تھی۔ اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے

زلف صنم ہے مشکبو سارے جہاں میں قاصدا
آہوے چین جہاں ملے جانیو یار کی گلی (۱۰۶)

شاہرخ، مرزا: بہادر شاہ کے لڑکے تھے۔ صہبائی ان کی اتالیقی کی خدمت پر مامور تھے۔ محمد حسین آزاد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''مولوی امام بخش مقتول کے شاگرد تھے۔ ان سے فارسی پڑھا کرتے تھے۔''(۱۰۷)

ناصر نذیر فراق لکھتے ہیں:

''مرزا شاہرخ، حضرت ابوظفر بہادر شاہ کے اولوالعزم فرزند دلبند تھے۔ مولوی امام بخش صہبائی کو اتالیقی کی خدمت سپرد تھی۔''(۱۰۸)

شمس العلما محمد حسین آزاد نے مرزا شاہرخ کے حوالہ سے ایک ایسا واقعہ صہبائی کے بابت لکھا ہے، جس کے ہر لفظ سے ان کی بددیانتی جھلکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۱۸۴۹ء میں بادشاہ کا ایک بیٹا مرزا بلاقی گیارہ برس کی عمر میں مر گیا۔ استاد محترم ----(نے) فرمایا حضور کا ایک قطعہ میں ابھی درست کر کے آیا ہوں۔ مقطع ہے ؎

اب حال یہ ہے عالم پیری میں اے ظفر
باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کا

کئی دن بعد پھر آئے۔ فرمایا! قلعہ سے آتا ہوں۔ مرزا شاہرخ کہنے لگے! بھئی استاد! ہم نے مولوی (صہبائی) صاحب کو حضور کا وہ قطعہ سنایا۔ انہوں نے کہا ''شنود'' نہیں ''شنید'' چاہیئے۔''(۱۰۹)

اس واقعہ میں کہاں تک سچائی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو جاتا ہے کہ مرزا شاہرخ ۱۸۴۷ء میں اور مرزا بلاقی ۱۸۴۹ء میں مرے۔ اس لئے مرزا شاہرخ کی طرف اس واقعہ کا انتساب درست نہیں معلوم ہوتا۔ حافظ محمود شیرانی اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد، صہبائی سے جو ان کے استاد بھی ہوں گے، کسی وجہ سے خفا ہیں۔ اس لئے یہ غلط انداز تیر کمان سے نکلا۔ ورنہ اس عہد کے فارسی نگار مثلاً غالب ''شنودن'' کثرت سے لاتے ہیں۔''(۱۱۰)

شرر، منسارام: کایستھ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ درسی کتابوں کی تحصیل اور شعر کی اصلاح بھی صہبائی سے لیا کرتے تھے۔ فارسی میں شاعری کرتے تھے

زلف پیچان وعذار تو بہ گلزار چودید
سنبل آشفتہ وگل چاک گریباں بر خاست (۱۱۱)

شفقت، میر محمد حسین: قصبہ گلاوٹھی وطن تھا۔ کسب کمالات کے لئے شاہجہاں آباد کو مسکن بنایا۔ صہبائی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ فارسی زبان کی شستگی اور اردو کی صفائی اور سادگی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے

جوں شمع یاں کٹے گا سر ایک ایک بات پر
شفقت عبث تو بزم میں آتش زباں نہ ہو (۱۱۲)

شوق، عنایت اللہ: متوطن فرید آباد، شاگرد مولوی امام بخش صہبائی، بسبیل روزگار پنجاب میں رہتے تھے۔ اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے

کروں میں شکوۂ اغیار کس طرح جب شوق
ملا ہو یار ہی قسمت سے بے وفا مجھ کو (۱۱۳)

شیدائی، مولوی ابوالحسن: سابقاً حسن تخلص کرتے تھے۔ ایام طفولت میں وطن مالوف سے شاہجہاں آباد بغرض تعلیم آئے اور صہبائی کی شاگردی اختیار کی۔ سرکار انگریزی سے وظیفہ ملتا تھا۔ فارسی میں شاعری کرتے ہیں۔

این طفل اشک بین کہ بخلق آشکار کرد
دردل ہر انچہ بود زعشقت نہاں مرا

نیست این سرلائق پایش یقین دارم حسن
می برد پای ملخ پیش سلیمان مورما (۱۱۴)

شیدائی، مرزا رمضان بیگ: مغل خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ صہبائی سے

فارسی کی درسی کتابوں کی تحصیل کی۔ فارسی میں شعر کہتے ہیں

باخضر احتیاج نہ افتد براہ ما

جز عشق نیست پیر طریقت پناہ ما

ہر دو جہان کہ تاج سر حرص عالمیست

کمتر بود زخاک بہ پیش نگاہ ما (۱۱۵)

صابر، مرزا قادر بخش: امام بخش صہبائی کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ''گلستان سخن'' ان کی مقبول عام کتاب ہے۔ بعض اسے صہبائی سے منسوب کرتے ہیں، جو سراسر غلط ہے۔ عام تذکروں میں ان کے حالات مل جاتے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مولوی صدرالدین خاں: نظام الدین خاں کے لخت جگر، رامپور میں پیدا ہوئے۔ دیگر اساتذہ کے علاوہ صہبائی سے علوم متداولہ حاصل کئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں پانچویں رجمنٹ کے افسروں اور ایک لیڈی کو اپنی جان خطرہ میں ڈال کر بچایا۔ مہاراجہ تکوجی راؤ ہلکر کے مصاحبوں میں تھے اور ان کے پولیٹکل وکیل بھی ہوئے۔ مہاراجہ ان کی بہت قدردانی کرتے تھے۔ حج سے مشرف ہو کر بحالت سفر ۶ ستمبر ۱۸۹۰ء کو بمبئی میں لاولد انتقال فرمایا۔ ''انشاے بے نظیر'' ان کی یادگار ہے۔ (۱۱۶)

طرب، مولوی رحیم بخش: شیخ نور محمد قادری تھانیسری کے نواسہ تھے اور صہبائی کے رشتہ دار۔ ان سے اور ان کے لڑکے عبدالکریم سوز سے تلمذ تھا۔ تاریخ گوئی میں مہارت تھی۔ غدر کے بعد تک زندہ رہے۔ اردو میں شعر کہتے تھے

اے طرب عشق سے پرہیز ہے لازم تجھ کو

جان جائے گی کسی بت پہ اگر دل آیا (۱۱۷)

عالی، امیر علی تھانیدار: کمالات باطنی اور سعادات باطنی سے مشرف اور ممتاز تھے۔ فارسی میں مہارت تھی۔ صہبائی کی شاگردی نے اسے مزید جلا بخشی۔

بالا کشیدہ شعلہ آتش زداغ ما
روشن بود بہ ظلمت شبہا چراغ ما(۱۱۸)

عزیزؔ، عبدالعزیز: صہبائیؔ کے لایق وفایق لخت جگر تھے۔ تمام تذکرہ نگاران کی خوبیوں اور صلاحیتوں کے معترف نظر آتے ہیں۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں:

"علمی استعداد معقول تھی۔ فن سخن میں اپنے پدر عالی قدر کے شاگرد تھے۔ ایام غدر میں ظفریاب لشکر کے ہاتھوں بے گناہ شہید ہوئے۔ طبیعت کا رنگ نرالا ہے۔ بہت پر لطف اور دل میں اتر جانے والے شعر کہتے تھے۔ خیالات میں باریکی ہے۔ زبان صاف ہے۔"(۱۱۹)

اور ذوقؔ دہلوی نے اس طرح داد دی ہے، مرزا فرحت اللہ کی زبانی اسے سنئے:

"(عزیزؔ کی) غزل سن کر استاد ذوقؔ نے کہا! بھئی صہبائیؔ! تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ ایک دن بڑا نام پیدا کریگا۔ واہ میاں صاحب زادے کیا کہنا! ہے ہے دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"(۱۲۰)

لیکن زندگی نے زیادہ دن تک وفا نہ کی اور ظالم انگریزوں کے ہاتھوں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اپنے والد اور بھائی کے ساتھ شہید ہوئے۔

عنایت، عنایت علی خاں: نواب زادہ تھے۔ ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔ نواب عبدالعلی خاں کے لڑکے اور عباس علی خاں بیتابؔ کے چھوٹے بھائی تھے۔ فارسی میں صہبائیؔ سے اور ریختہ میں میر حسین تسکینؔ سے تلمذ حاصل تھا۔

میں اس کے دوش سے محفل میں لگ کے بیٹھ گیا
تو یہ بھی دیکھ کے اغیار بے حیانہ اٹھے (۱۲۱)

عیشؔ، رائے عزت سنگھ: خوش خلق و نیک نہاد، علوم ضروری سے آگاہ اور قواعد سخنوری سے واقف تھے۔ فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے۔ فارسی میں

صہبائی سے اور ریختہ میں شاہ نصیرؔ سے شرف تلمذ تھا

می دہد افسانۂ شیخ و برھمن حیرتم
آخر از یک کشورست این مختلف اخبار ھا

نہ ہو پست و بلند دہر سے غافل تو اے منعم
کہیں نیچی کہیں یہ راہ ناہموار نیچی ہے(۱۲۲)

غریبؔ، غریب اللہ: شاہ آباد وطن اصلی، مقیم شاہ جہاں آباد، ابتداء مومنؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ بعد میں صہبائیؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے

مفت میں پامالِ اعدا ہوگیا تو اے غریبؔ
ہم تو سمجھاتے تھے کوے دلربا میں تو نہ جا (۱۲۳)

فداؔ، مرزا بلند بخت: مرزا قادر بخش صابرؔ کے بڑے بھائی تھے۔ صہبائیؔ سے کسب فیض کیا۔

فروغؔ، محمد عمر: صاحب گلستان سخن کے صاحبزادے، والد اور صہبائیؔ سے شرف شاگردی حاصل تھا۔ اردو میں شعر کہتے تھے

دیا ہو جھوٹ ہی گو نامہ بر نے مژدۂ وصل
پر اس کے کہنے سے دل کو تو اک قرار آیا (۱۲۴)

فغاںؔ، پنڈت لال جی پرشاد: فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ صہبائیؔ سے کسب فیض کیا

یار طلب می کند نقد دلت را فغاںؔ
دل بدہ از دست یا خاطر دل بر شکن (۱۲۵)

قاصرؔ، حکیم علی حسن: ولد حکیم سید محمد، قوم پنجابی، محلہ کھنڈ سار، رامپور میں ۱۲۱۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ایک عرصہ تک معلم گری کی۔ پھر طبابت کرنے لگے اور

لوگوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ اردو نظم کی طرف بھی توجہ تھی۔ فارسی میں پہلے نصیر الدین خاں صابر سے تلمذ ہوا پھر مولوی امام بخش صہبائی دہلوی سے مشورہ ہوا۔ ۱۳۳۳ھ میں انتقال فرمایا۔ (۱۲۶)

قلق، سلطان خاں: افغانی النسل تھے۔ علوم رسمی میں استعداد کامل اور فنون متداولہ میں دستگاہ تمام۔ صہبائی سے تلمذ تھا۔ ریختہ بھی کہا کرتے تھے

مر کے بھی اس کے نظارہ کی تمنا نہ گئی

کون سا سبزہ کہ وہ نرگس شہلا نہ ہوا (۱۲۷)

قلق، مولا بخش: میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۱۴ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔ صہبائی سے فارسی کی تکمیل کی (۱۲۸)۔ بعد میں مومن کے حلقہ تلامذہ میں شریک ہو گئے۔ قلق اور عبدالکریم سوز کے مابین برابر معرکہ آرائی ہوتی تھی، جس میں قلق کو بارہا زار اور حزیں ہونا پڑا (۱۲۹)۔ قلق نے حضرت صہبائی کی شاگردی کیوں ترک کی؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے شمس العلما محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

"----ایک دن خان صاحب (مومن) کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنی پوچھے۔ انہوں نے ایسے نازک معنی اور نادر مطالب بیان فرمائے کہ قلق معتقد ہو گئے اور کہا کہ مولوی صاحب (صہبائی) نے جو معنی بتائے ہیں وہ اس سے کچھ بھی نہیں نسبت رکھتے ہیں۔" (۱۳۰)

اس واقعہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

"لیکن وہ شعر نہ لکھا، نہ کسی صاحب کے معنی لکھے ہیں۔ ایسی باتوں کو آزاد نے افسوس کے ساتھ ترک کر دیا۔ شفیق مکرم معاف فرمائیں۔" (۱۳۱)

قناعت، مرزا غلام نصیر الدین: خلف الرشید مرزا ولی الدین، سخن سنجی میں یگانہ اور معنی یابی میں یکتائے روزگار تھا۔ اول مشق سخن احسان سے بہم پہنچائی۔ پھر صہبائی اور صابر کے تلامذہ میں شامل ہو گئے

گر انقلاب دہر یہی ہے تو ہے امید
آجائے گا زمانہ کبھی وصل یار کا (۱۳۲)

کریم الدین، مولوی : اردو شعرا کے تذکرہ کی مشہور زمانہ کتاب " طبقات شعرائے ہند " کے مصنف مولوی کریم الدین کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے حالات بکثرت مل جاتے ہیں۔ یہ بھی خرمن صہبائی کے خوشہ چیں تھے۔

ماہر، جمعیت شاہ: خلف الصدق مرزا زور آور بخت مرحوم ابن مرزا جمشید بخت، غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ اور ترجیع بند میں دستگاہ کامل لیکن غزل گوئی کی طرف التفات بحد کمال ہے۔ صہبائی، صابر اور سوز سے استفادہ کرتے تھے

پہلے اک سوز سا تھا دل میں پر اب تو ہمدم
شمع کی طرح ہے شعلہ مرے سر سے پیدا (۱۳۳)

مبتلا، پنڈت اجودھیا پرشاد : صاحب دیوان شاعر تھے۔ بقول ڈاکٹر انصار اللہ "ان کا قلمی دیوان جو ۱۸۹۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے " (۱۳۴)۔ قوم کے کشمیری تھے۔ رہنے والے دلی کے تھے۔ مرد متین، ذہین، عقلمند اور محنتی تھے (۱۳۵)۔ فارسی کتب کی تحصیل اور مشق سخن صہبائی سے بہم پہنچائی۔ فارسی میں شاعری کیا کرتے تھے۔

از دل ما ہر نفس بیرون نیامد غیر آہ
جز الف دیگر نخواند این طفل ابجد خوان را (۱۳۶)

صہبائی کے ہاتھ کا لکھا ہوا " قول فیصل " پنڈت دھرم نراین کو انہیں کے یہاں ملا تھا۔ انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے:

" پنڈت اجودھیا پرشاد مبتلا، آرزوی دیرینہ خود دست برد یعنی اصل مسودہ آن کتاب " قول فیصل " لطف انصاف از دست معزی الیہ بدست آوردہ۔ " (۱۳۷)

محوی، محمد بیگ: ریواڑی کے رہنے والے تھے۔ مدرسہ شاہجہاں آباد سے منسلک تھے۔ نظم و نثر فارسی اور ریختہ میں صہبائیؔ سے تلمذ حاصل تھا

محویؔ چو بگذری سوی گلزار عرض کن
با عندلیب عشق و قمری سلام ما

محویؔ کو قتل کر کے اب افسوس کیا ضرور
ہونا جو کچھ تھا وہ تو مرے یار ہو گیا(۱۳۸)

نامیؔ، بلدیو سنگھ: زور آور سنگھ کے لڑکے تھے۔ تاریخ گوئی میں ید طولی رکھتے تھے۔ صہبائیؔ کے حلقۂ تلامذہ میں تھے۔

نامیؔ عبث است این شکایت
در گوشش حرف رہ ندارد(۱۳۹)

نثارؔ، سید نثار علی: مولوی عبداللہ کے لڑکے تھے۔ ان کے جداعلیٰ مولوی رحمت اللہ، محمد شاہ بادشاہ کے استاد تھے۔ اور پرنانا مولوی اشرف، عالمگیر کے استاد تھے(۱۴۰)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاندان پڑھا لکھا تھا۔ صہبائیؔ اور مولوی عبداللہ خاں علویؔ سے فارسی کی تحصیل کی۔ معلم گیری کرتے تھے(۱۴۱)۔ یہ اپنے وقت کے قابل قدر خطاطوں میں سے تھے(۱۴۲)۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفرؔ کا دوسرا دیوان جو ۱۳ جلوس مطابق ۱۸۵۰ء میں مطبع سلطانی واقع قلعہ معلیٰ میں چھپا تھا، نثارؔ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا۔ حافظ محمود شیرانی کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا(۱۴۳)۔ سر سید کے بقول "مشق سخن صہبائی سے ہے" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی شعر گوئی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لگتا ہے کہ ان کا کلام حوادث زمانہ کی نذر ہو گیا ہو گا۔

ڈپٹی نذیر احمد : دہلی کالج سے وابستہ جن شخصیتوں کے نام قابل ذکر ہیں، ان میں ڈپٹی نذیر احمد سرفہرست ہیں۔ ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۴ء تک اسی کالج میں زیر تعلیم رہے اور صہبائی کی خدمت میں جدید علوم و فنون سے فیض یاب ہوئے۔ ناول نگاری میں نام پیدا کیا۔ ۱۸۳۴ء میں ولادت ہوئی اور ۳ مئی ۱۹۱۲ء کو انتقال کیا (۱۴۴)۔

نکہتؔ، حافظ غلام احمد : صہبائیؔ سے قرابت قریبہ اور انہیں سے تلمذ تھا۔ فارسی اور اردو دونوں میں فکر کرتے تھے۔ کلام حلاوت اور طرز نمک سے خالی نہیں ؎

رخ زرد و آہ سرد و جگر داغ بہر چیست
نکہتؔ بمن بگو کہ تو شیدای کیستی

نکہتؔ کے خود بخود کے الجھنے سے ہے یقیں
آتے کسی طرف سے ہیں اپنا کٹائے دل (۱۴۵)

نور حقؔ، شاہ محمد جمیل : بخارا سے وارد کشمیر ہوئے۔ بنارس کا رخ کیا اور صہبائیؔ سے استفادہ کیا۔ ریختہ کہا کرتے تھے ؎

کیا عجب گر یہ فروغ سخن آرائی ہے
نور حقؔ تو بھی تو اک ذرۂ صہبائیؔ ہے (۱۴۶)

ہجرؔ انصاری، محمد حسین : ضلع بلند شہر کے قصبہ جیور کے رہنے والے تھے اور وہاں کے قاضی زادوں میں تھے۔ صہبائیؔ سے شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ فارسی نثر و نظم میں دستگاہ کامل تھی۔ "قول فیصل" کی پہلی اشاعت پر انہوں نے فارسی میں ایک منظوم تقریظ لکھی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد وہ اندور میں ناظم عدالت دیوانی کے عہدہ پر فائز ہوئے (۱۴۷)۔ فارسی میں شاعری کرتے تھے ؎

زتاب آہ ہجرؔ ناتوان غافل مشو ظالم
کہ جادر آتش است از رشک او زلف چلیپارا (۱۴۸)

یقین واسطی گلاؤ ٹھوی، محمد حسین: امام بخش صہبائی کے برگزیدہ شاگردوں میں تھے۔ سر سید نے اپنی بعض تصانیف میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مولوی نجم الغنی رامپوری کی "بحر الفصاحت" میں بھی مثالاً ان کے اشعار درج ہوئے ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے شمس الحق خیال، حالی کے ہم عصروں میں تھے۔ "مسدس حالی" کے طرز پر جواباً "مسدس خیالی" لکھا۔ خیالی رامپوری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ دوسرے بیٹے انوار الحق، امیر مینائی سے مشورہ سخن لیا کرتے تھے۔ (۱۴۹)

معاصرین

انیسویں صدی میں دہلی علم و ادب کا مرکز اور شعر و سخن کا گہوارہ تھی اور بڑے بڑے دیو پیکر اور طویل قامت علما، فضلا، ادبا، شعرا اور انشا پرداز، محقق اور تنقید نگار منصۂ شہود پر جلوہ افگن تھے۔ مثلاً غالب، سر سید، صہبائی، آزردہ، شیفتہ، فضل حق، مومن، ذوق، ممنون، تسکین، عزیز، سوز۔ کہاں تک نام گنایا جائے۔ ان میں سے ہر ایک اقلیم سخن کا بے تاج بادشاہ تھا اور اپنا الگ اور منفرد مقام رکھتا تھا۔ اس دور پر اظہار خیال کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

> "تیرھویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجہ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے۔ حسن اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے، جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھی۔" (۱۵۰)

ان میں سے اکثر معاصرین سے صہبائی کے تعلقات بہت ہی خوشگوار تھے اور شاید ہی کوئی شخص ہوگا، جس کے ساتھ ان کے تعلقات و مراسم اچھے نہ رہے ہوں۔ ذیل میں ان کے چند معاصرین کا تذکرہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

سر سید: سر سید احمد خاں کی ولادت ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔ اس لحاظ سے سر سید، صہبائی سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ وہ صہبائی کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ علمی صحبتوں میں موجود رہتے تھے اور علمی مذاکروں سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

"جب انہوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا اور دلی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب، اور آزردہ وغیرہ ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔" (۱۵۱)

سر سید، صہبائی کو ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے تعظیم و تکریم کرتے تھے اور ان پر اپنی جان نچھاور کرتے تھے اور ہر قسم کا تعاون کرتے رہتے تھے۔ حالی تحریر کرتے ہیں:

"مولانا صہبائی سے ان (سر سید) کی دوستی اخوت کے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ مولانا سے جو طالب علم مکان پر فارسی پڑھنے آتے تھے۔ ابتدا میں وہ سر سید ہی کے مکان پر ان کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ مفتی صدر الدین خاں کے ہاں بھی ان کا ایک پھیرا ضرور ہوتا تھا جہاں صہبائی اور شیفتہ اور مومن وغیر ہم کا مجمع رہتا تھا۔" (۱۵۲)

اس زمانے میں علمی محفلیں ہوا کرتی تھیں جہاں باکمال لوگ جمع ہوتے تھے اور علمی موشگافیوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اسی ایک محفل کا تذکرہ کرتے ہوئے سر سید مرحوم لکھتے ہیں:

"دل بہلانے کے لئے اپنے باغ میں گیا، جو ایک بڑا باغ تھا اور جوانی اور ولولے کے زمانے میں، میں نے اس کو از سر نو آراستہ کیا تھا اور وہاں اکثر

دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ غالبؔ کی دل کش و محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے، آزردہؔ کی دلچسپ و دل ربا فصاحت سے، شیفتہؔ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے، صہبائیؔ جاں نواز کے میخانۂ محبت سے دل شاد شاد رہتا تھا۔ (۱۵۳)"

ان مجلسوں کے بارے میں ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں:

"باتیں تو ان صحبتوں کی یادگار ہیں، جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کجا وہ صحبتیں، کجا وہ مجلسیں، کہاں وہ آزردہؔ، کہاں وہ شیفتہؔ اور کہاں وہ صہبائیؔ، کہاں وہ علما وہ صلحا۔ صرف یاد ہی یاد ہے۔" (۱۵۴)

تعطیلات کے موسم میں دونوں عام طور پر ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ جب سرسید کو بیرون شہر کی تحقیقات کے سلسلے میں باہر جانا ہوتا تو صہبائیؔ بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ حالیؔ لکھتے ہیں:

"سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے لئے شہر کے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائیؔ مرحوم ہوتے تھے۔" (۱۵۵)

مولانا صہبائیؔ بھی سرسید کو بہت عزیز رکھتے تھے اور بڑے بھائی کا سا سلوک کرتے تھے اور ہر دکھ درد میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کے دوران زندگی میں سرسید نے دو بڑے علمی کارنامے انجام دیے۔ آثار الصنادید اور آئین اکبری کی تدوین۔ آثار الصنادید تو صہبائی کے رنگین قلم کا ثمرہ ہے جسے بعد میں سرسید نے آسان و سہل زبان میں منتقل کیا۔ آئین اکبری کی تدوین کو اکثر لوگوں نے بے کار محض تصور کیا۔ چنانچہ غالبؔ نے اپنے منظوم تقریظ میں اس کو سعی لاحاصل کہا (۱۵۶) اور شیفتہ نے جو تقریظ لکھی اس میں بھی کچھ اسی طرح کا اشارہ تھا۔ لیکن صہبائیؔ ہی وہ واحد شخص تھے

جنہوں نے اس دور میں اس کی افادیت کو ثابت کیا اور سر سید نے بھی انہیں کی تقریظ کو کتاب میں شامل کیا اور دوسرے لوگوں کی تقریظوں کو واپس کر دیا۔ الغرض دونوں کے مابین خوشگوار تعلقات قائم تھے۔

آزردہ: مفتی صدر الدین آزردہ کی ولادت ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں ہوئی۔ انگریزی سرکار میں ان کی بڑی عزت تھی۔ مرزا غالب، مومن، شیفتہ، فضل حق خیر آبادی اور صہبائی سے اچھے تعلقات تھے۔ صہبائی کے محسنوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اپنے اس محسن کو کبھی بھلا نہ پائے اور برابر ان کے دیوان خانہ میں حاضری دیتے رہے۔ مزید براں صہبائی نے ان کی مدح و توصیف میں ایک زوردار قصیدہ بھی کہہ ڈالا جس سے یہ پتا چلتا ہے کہ صہبائی کی نظر میں آزردہ کی کیا وقعت تھی۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی لکھتے ہیں:

"اپنے معاصرین میں غالب اور آزردہ کو انہوں نے نہایت انصاف پسندی اور فراخ دلی سے کئی جگہ خراج تحسین پیش کیا ہے۔" (۱۵۷)

آزردہ سے صہبائی اتنے متاثر تھے کہ ان کو ایرانیوں کا ہم پلہ سمجھتے تھے۔

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید (۱۵۸)

اور ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

نالۂ غالب و آزردہ زکف برد عنان
سوختم سوختم از آتش گرم دم شان (۱۵۹)

آزردہ بھی صہبائی کی صلاحیت کے معترف تھے۔ جب دہلی کالج میں فارسی استاذ کے تقرر کا معاملہ آیا تو آزردہ نے جن تین لوگوں کی فارسی دانی کی تصدیق کی تھی، ان میں ایک صہبائی بھی تھے۔ اس زمانے میں فارسی داں حضرات کی کمی نہ تھی لیکن اس جم غفیر میں سے تین کا انتخاب کیا اور اس تین میں ایک صہبائی کا ہونا اس کا

بین ثبوت ہے کہ آزردہ، صہبائی کی علمیت اور قابلیت سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کا احترام واکرام کرتے تھے۔ جب صہبائی کی شہادت ہوئی تو آزردہ پر اس کا کافی اثر ہوا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو　　قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

فضل حق خیر آبادی: ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ علوم منطق، فلسفہ، ادب، کلام، اصول اور شاعری میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور اعلی قابلیت رکھتے تھے۔ صہبائی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کا ایک دیوان خانہ تھا، جہاں روز باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ اس میں شریک ہونے والے ایک صہبائی بھی تھے۔ چنانچہ جب کالج سے واپس آتے تو ہواخوری کے بجائے ان کے دیوان خانے کی راہ لیتے اور مغرب تک وہیں رہتے۔ اس دیوان خانے میں حاضری ان سے زندگی بھر قضا نہیں ہوئی۔ صہبائی چونکہ وسیع المشرب تھے۔ اس لئے تمام معاصرین سے ان کے تعلقات استوار رہے اور کبھی بگڑے نہیں۔

شیفتہ: نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں اس دار فنا میں جلوہ افروز ہوئے۔ حکیم مومن خاں مومن سے مشق سخن بہم پہنچائی۔ صہبائی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ شیفتہ کی کتاب "گلستان بے خزاں" پر اپنی تقریظ میں جو کہ نثر و نظم کا ایک طلسم ہے، ان کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔ اور شیفتہ کی نظر میں صہبائی کی تحریر اتنی وقیع تھی کہ انہوں نے اپنے تذکرہ کے لئے زینت کا سبب خیال کر کے، اسے اس میں شامل کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حضرات ایک دوسرے کی قابلیت وصلاحیت سے بخوبی واقف تھے اور دونوں میں کسی قسم کی معاصرانہ چشمک نہیں تھی۔

غالب: صہبائی کے معاصرین میں ایک غالب ہی ایسے تھے، جو ان سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ ان کے علاوہ اور کوئی شخص ہمیں ایسا نہیں ملا، جس کے بارے میں کہا جائے کہ اس سے صہبائی کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ غالب ایسے

خود بیں اور انا پرست تھے کہ ان کو اپنے علاوہ ہر کوئی ہیچ نظر آتا تھا۔ انہوں نے ایک امیر خسرو کے علاوہ کسی کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ چونکہ اس زمانے میں صہبائی کی علمیت اور فارسی دانی بام عروج تک پہنچ چکی تھی اور لوگوں میں کافی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جارہے تھے۔ صہبائی کی یہ قدر و منزلت غالب کو ایک آنکھ نہ بھائی اور نتیجتاً ان کے درپئے آزار رہنے لگے۔ لیکن صہبائی کی طرف سے اس کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا اور برابر اپنے آپ کو غالب کی جملہ بازیوں سے بچاتے رہے۔

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء سے قبل ہی دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے اور دونوں کے درمیان مثبت روابط استوار ہو چکے تھے اور دونوں ایک دوسرے کے مقام و مرتبہ سے بھی اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ صہبائی نے تو ہمیشہ ان کی علم دانی اور شاعری کی تعریف ہی کی۔ چنانچہ ایک شعر میں ازراہ علم نوازی غالب کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

طاقت هم طرحی غالب ندارد طبع من
بر پیش رفتم زنقشش گردهٔ برداشتم (۱۶۰)

دوسری جگہ غالب اور آزردہ کے بارے میں کہتے ہیں ؎

نالۂ غالب و آزرده زکف برد عنان
سوختم سوختم از آتش گرم دم شان" (۱۶۱)

حتی کہ وہ غالب اور آزردہ سے اتنا متاثر تھے کہ ان دونوں کو ایرانیوں کے برابر سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

چو دیدم غالب و آزرده را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید (۱۶۲)

غالب بھی صہبائی کی صلاحیتوں کا اور ان کی شاعری کا اعتراف کرتے تھے۔ غالب، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو اپنے ایک خط میں ایک مشاعرے کی روداد بیان

کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جمعہ کی شب کو ۲۳ مارچ بزم سخن آراستہ ہوئی۔ میں نے طرحی زمین میں غزل نہیں کہی تھی۔ اس لئے مشاعرہ میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں نے نواب زین العابدین خاں عارفؔ اور غلام حسن خاں محوؔ کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کردیا۔ صہباؔئی نے طرحی زمین میں غزل پڑھی، دو تین شعر دلنشیں تھے۔" (۱۶۳)

غالبؔ کا صہباؔئی کے دو تین اشعار کو دلنشیں قرار دینا۔ اس کا بین ثبوت ہے کہ غالبؔ کی نظر میں صہباؔئی کی کافی وقعت و عزت تھی اور ان دونوں کے درمیان کوئی بگاڑ، رنجش اور کشیدگی نہیں تھی۔ البتہ مرزا کی شوخیاں اور جملہ بازیاں صہباؔئی کی طبع پر گراں گزرتی رہی ہوں گی اور صہباؔئی ان سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہوں گے۔ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ دونوں کے درمیان علمی معاملوں میں کافی نوک جھونک ہوتی تھی۔ مولوی محمد بشیر الدین احمد اسی طرح کا ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا امام بخش صہباؔئی کی رائے "پنج رقعہ" اور "مینابازار" کی نسبت یہ تھی کہ یہ دونوں تحریریں مثل سہ نثر ظہوری، ملا ظہوری کی ہیں۔ مگر مرزا اس کے خلاف تھے۔ ایک جلسے میں دونوں صاحب موجود تھے۔ اتفاق سے ذکر چھڑ گیا۔ مرزا نے کہا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص نظم و نثر دونوں پر قادر ہو اس کی نثر میں کہیں نظم نہ پائی جائے۔ مولانا صہباؔئی نے کہا کہ ایسے اتفاق اکثر ہو جاتے ہیں۔ یہ محض ایک اتفاق کی بات ہے۔ مرزا نے کہا بے شک! مگر یہ ایسا اتفاق ہوگا کہ ایک شخص ہر ایک لحاظ سے نہایت سنجیدہ اور معقول آدمی ہے مگر اتفاق سے کبھی کبھی کاٹ بھی کھاتا ہے۔" (۱۶۴)

اسی قسم کا ایک واقعہ محمد حسین آزادؔ نے بھی لکھا ہے:

"دلی میں مشاعرہ تھا، مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی امام بخش صہبائی جلسے میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرعہ پڑھا۔

بوادی کہ دران خضر را عصاخفت است

مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ "عصاخفت است" میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت میں ہندی نژاد ہوں۔ میرا عصا پکڑ لیا۔ اس شیرازی کا عصا پکڑا گیا ۔

ولی بجملہ اول عصای شیخ خفت است

انہوں نے کہا کہ اصل محاورہ میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں۔" (۱۶۵)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس قسم کی جملہ بازی سے قطع نظر صہبائی کے خلاف مرزا کی جو تحریریں ملتی ہیں۔ وہ سب صہبائی کی شہادت کے بعد کی ہیں۔ شہادت کے بعد کی جو تحریریں مرزا کی ملتی ہیں، ان میں صہبائی کا ذکر نہایت حقارت اور مذمت کے لہجے میں ہے۔ غالب نے اپنے ہم عصروں کے متعلق ایک قطعہ میں بہت اچھی رائے ظاہر کی ہے۔ قطعہ ہے ۔

ای کہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم
چہ بمامنت بسیار نہی از کم شان
ہندرا خوش نفسا نند سخنور کہ بود
باد در خلوت شان مشک فشان از دم شان
مومن و نیر وصہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف وآزردہ بود اعظم شان
غالب سوختہ جان گرچہ نیرزد بشمار

ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شان (۱۶۶)

اس قطعہ پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے مالک رام لکھتے ہیں:

"غالبؔ کے مذکورہ قطعہ سے یہ خیال ہو گا کہ وہ صہبائیؔ کی شاعری کے قائل اور معترف ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ خدا معلوم وہ کس تاثر کے تحت یہ لکھ گئے۔ ورنہ انہوں نے اور جہاں کہیں بھی صہبائیؔ کا ذکر کیا ہے، حقارت اور مذمت کے لہجے میں۔" (۱۶۷)

صہبائیؔ کے ایک شاگرد مرزا رحیم بیگ میرٹھی نے غالبؔ کی قاطع برہان کے جواب میں ساطع برھان نامی ایک کتاب لکھی۔ اس میں انہوں نے اپنے آپ کو صہبائیؔ کا شاگرد لکھا اور اپنے استاد کو "امام المحققین" کے لقب سے نوازا۔ یہ تعریف و تکریم غالبؔ کو نہایت ہی ناگوار گزری اور فوراً "نامہ غالب" کے نام سے مرزا رحیم بیگ میرٹھی کو ایک کھلا خط لکھا۔ اس میں غالبؔ لکھتے ہیں:

"یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو "امام المحققین" کا خطاب دیا ہے کتنے محققین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے۔ جب تک نہ اجماع محققین ہو گا۔ یہ خطاب بہ اجماع اہل عقل ناجائز و ناروا ہو گا -- اگر حضرت بفتحہ قاف بصیغہ تثنیہ "امام المحققین" کہتے تو ایک ماموم آپ ہوتے اور نارائن داس تنبولی دوسرا ہوتا۔" (۱۶۸)

ایسا ہی ایک خط میں اپنے شاگرد مولوی عبدالرزاق شاکرؔ مچھلی شہری کو لکھتے ہیں:

"--- نامہ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا، لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان

کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و وقار ہو۔" (۱۶۹)

اس خط میں غالب کا یہ کہنا کہ مرزا رحیم بیگ میرٹھی کو صہبائی سے شرف تلمذ نہیں ہے سراسر حقیقت سے انکار کرنا ہے۔ جبکہ گلستان سخن میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مرزا رحیم بیگ میرٹھی صہبائی کے شاگرد ہیں (۱۷۰)۔ دراصل بات یہ تھی کہ مرزا غالب "برھان قاطع" کے سخت مخالف تھے اور اپنی کتاب میں انہوں نے اس کی غلطی کی نشاندہی کی تھی۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ جن میں صہبائی اور مرزا رحیم بیگ ہیں، "برھان قاطع" کی حمایت میں تھے جس کی وجہ سے غالب ان لوگوں کے خلاف برسرپیکار ہوئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ غالب خود بیں، انا پرست، مغرور، ضدی، خود غرض، مطلب پرست، شاہدان بازاری کے دلدادہ، شراب نوشی کے رسیا، قمار بازی میں ماہر اور دوسروں کی ہجو گوئی اور عیب جوئی میں اپنے دور کے تمام لوگوں میں دو چار قدم آگے ہی تھے۔ شمس العلما ذکاء اللہ دہلوی اپنے ایک مکتوب میں غالب کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"----اب مرزا غالب کا یہ حال ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی اور خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج ٹھیاریوں (کذا) کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ صہبائی شعر کہنا کیا جانے۔ نہ ان نے شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھوں سے جوتیاں کھائیں، نہ جیل خانے میں پڑا۔ طامع ایسا تھا کہ ایک قصیدہ دس جگہ بیچتا تھا۔" (۱۷۱)

صہبائی کے بارے میں ان کی عداوت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ شہادت کے بعد بھی ان کو نہیں چھوڑا اور ان کو بدنام کرنے میں لگے رہے۔

اس کے علاوہ ذوقؔ، ممنونؔ اور مومنؔ وغیرہ سے بھی صہبائی کے اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کے اشعار اپنی اردو تصانیف میں تعریفی انداز میں نقل کئے ہیں۔ اور "انتخاب دواوین" میں ان کے حالات شامل کر کے ان کی شعری خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ذوقؔ کو تو وہ اپنے "الطاف گستران شفیق" میں شمار کرتے تھے (۱۷۲)۔ اور جب ممنونؔ کی وفات ہوئی تو انہوں نے یہ شعر کہہ کر اپنے جذبات رنج والم کا اظہار کیا

میر ممنونؔ از جہان بگذشت و نزد عالمی
زندگی را از ممات بود حکم ممات

سیاسی زندگی اور شہادت

تذکرہ نگاروں نے عام طور پر صہبائیؔ کے علمی وادبی پہلو ہی کو اجاگر کیا ہے اور ان کی سیاسی زندگی کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کی سیاسی تاریخ میں علماء کا جو رول رہا ہے اس کی نظیر دوسری جگہ ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔ ان میں سب سے نمایاں نام امام بخش صہبائیؔ کا ہے۔ آج تک صہبائیؔ کی سیاسی زندگی نظروں سے اوجھل رہی ہے اور ہمارے تذکرہ نگاروں نے بھی کوئی خاص محنت نہیں کی۔ جبکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں علما کا جو رول رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اب جب کہ سارے حقائق یکے بعد دیگرے روشن ہوتے جا رہے ہیں تو آج کے دانشوروں کا یہ فرض بنتا جا رہا ہے کہ وہ ان شخصیات پر از سر نو تحقیق و جستجو کریں، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ بعض علما صرف جنگ آزادی میں لگے ہوئے تھے تو بعض ایسے بھی تھے جو درس و تدریس اور تصنیف و تالیف

کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔ انہیں میں ایک نمایاں نام امام بخش صہبائی کا ہے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی کے بقول:

"ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں علماء کا جس قدر شاندار کارنامہ اور جذبۂ وطنیت کا مظاہرہ ہے۔ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار اور تغلب اور استیلا کے خلاف سب سے پہلے علماہی کی آواز مخالف اٹھی۔ انہیں علما میں کا پہلا فرد محترم جو سربکف میدان عمل میں آیا وہ دلاور جنگ مولوی احمد اللہ مدارسی تھا۔ ان کے ہم نوا کثیر التعداد علما تھے، جو ایک طرف درس و تدریس و تصنیف و تالیف میں لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف سیاست ملکی میں حصہ لے رہے تھے۔ ان میں نمایاں شخصیت مولانا امام بخش صہبائی شہید، مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مولوی عظیم اللہ کانپوری، منیر شکوہ آبادی وغیرہ تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ان بزرگوں کے سیاسی حالات سے تذکرہ نویسوں نے چشم پوشی کی۔" (۱۷۳)

جب کہ تاریخی کتب شاہد ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی ناکام ہونے پر جب انگریزوں نے غلبہ پایا تو انہوں نے مسلمانوں کو ہی اپنا اصلی حریف وہدف قرار دیا۔ اور ایسے ایسے ظلم و ستم توڑے کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ دہلی جو عالم میں انتخاب تھا، تباہی و بربادی کے دہانے تک پہنچ گئی۔ ہر طرف کشت وخون کا بازار گرم ہو گیا۔ باکمالوں کا وہ جمگھٹا جو دہلی کے لئے باعث زیب وزینت اور فخر وناز تھا، تہس نہس کر دیا گیا۔ کوئی بھی باوقار اور ذی حیثیت مسلمان انگریزوں کی دار وگیر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اسی دار و گیر کی زد میں صہبائی کا پورا خاندان آگیا۔ آخر کار اپنے دونوں لخت جگر کے ساتھ انگریز کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

صہبائی دہلی کے مشہور محلہ کوچہ چیلان میں رہتے تھے۔ یہ وہی محلہ ہے جو

مولانا شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ، سر سید احمد خاں، مولانا مملوک علی، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مفتی کفایت اللہ اور منشی ذکاء اللہ کا مسکن تھا۔ اور اسی محلّہ پر سب سے زیادہ مصیبت آئی۔ خواجہ حسن نظامی تحریر فرماتے ہیں:

"دہلی کے تمام محلوں میں زیادہ چیلان کے کوچہ پر مصیبت آئی تھی۔ اسی محلّہ میں بڑے بڑے شرفا اور نامور علما رہتے تھے ---- غرض یہ محلّہ بڑے بڑے صاحب کمال لوگوں کا مخزن تھا۔" (۱۷۴)

کوچہ چیلان میں اچانک یہ قیامت کیوں ٹوٹ پڑی کہ بے قصور و بے گناہ بھی اس سے جانبر نہ ہو سکے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے شمس العلما ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

"نواب شیر جنگ کے بیٹے محمد علی خاں نے ایک (انگریز) سپاہی کو اس لئے زخمی کیا تھا کہ وہ ان کے زنانے میں بدنیتی سے جانا چاہتا تھا۔ اس قصور میں (انگریز) حاکموں نے حکم دیا کہ اس کوچے کے سارے مردوں کو مار ڈالو۔ ان بے گناہ مقتولوں میں ایک صاحب کمال مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے کنبہ کے ۲۱ افراد بھی تھے۔" (۱۷۵)

آخر صہبائی سے وہ کون سا جرم اور خطا سرزد ہوئی تھی، جس کی وجہ سے وہ اس انجام تک پہنچے۔ جبکہ وہ دلی کالج میں پروفیسر تھے اور مولوی ذکاء اللہ جیسے انگریز پرست بھی صہبائی کی بے گناہی کے شاہد ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ لکھتے ہیں:

"صہبائی دلی کالج کے ہر دلعزیز استادوں میں تھے، جو انگریزوں کی نگرانی میں تھا۔ اس تعلق کے باوجود صہبائی کے خاندانوں کے ڈیڑھ درجن سے بھی زائد افراد شہید کر دیے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کی ملازمت میں ذہنی طور سے ان کے "ملازم" نہیں ہو سکے۔ وہ 'المامور معذور" کے مصداق انگریز پرنسپل کے احکام کی دیانتداری سے تعمیل کرتے۔ لیکن دل سے اپنے مذہب اور اپنے بادشاہ کے معتقد اور حامی

تھے۔'' (۱۷۶)

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صہبائی کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ نیز جس محلہ میں ان کی سکونت تھی، وہاں جنگ آزادی کے سپاہی شروع سے موجود تھے اور اس میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اس سے متاثر نہ ہوئے ہوں گے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں:

''صہبائی کے ساتھ مولانا فضل حق، مفتی صدرالدین آزردہ وغیرہ اس جنگ آزادی میں شریک تھے۔ ان کو بھی شرکت کرنی پڑی تھی۔ قلعہ میں بہادر شاہ نے مجلس شوریٰ منعقد کی۔ اس میں یہ بھی بلائے گئے۔ جب پانسہ الٹا پڑا، انگریز فاتحانہ طور سے دلی میں داخل ہوئے۔ جنرل بخت خاں وغیرہ میدان چھوڑ گئے۔ غرض کہ جو زد میں گوروں کے آیا، وہ گولی کا نشانہ ہوا۔'' (۱۷۷)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صہبائی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف زبانی طور پر بلکہ عملی طور پر بھی حصہ لیا تھا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کا قلعہ میں صہبائیؔ کا مدعو کرنا، اس کا بین ثبوت ہے۔ اس کے برعکس بعض حضرات کا خیال ہے کہ صہبائی گرچہ انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بنے مگر انہوں نے اس میں عملی طور پر حصہ نہیں لیا۔ غلام رسول مہرؔ رقم فرماتے ہیں:

''اسی طرح مولانا امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہؔ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ یقیناً ہدف ستم بنے۔ لیکن انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔'' (۱۷۸)

مہرؔ کی تحقیق مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ انہوں نے صہبائیؔ، آزردہؔ اور شیفتہؔ کا قد کافی چھوٹا کر دیا ہے۔ وہ یہ تو مانتے ہیں کہ یہ لوگ انگریزوں کے ہدف ستم بنے۔ لیکن ان کے عملی حصے سے وہ انکار کرتے ہیں۔ اگر عملی حصہ نہیں لیا تو ہدف ستم کیوں

بنے اور صرف یہی لوگ کیوں بنے جب کہ دوسرے حضرات مثلاً سرسید، ذکاء اللہ وغیرہ کو یہ حالات پیش نہیں آئے۔ حالانکہ اکثر لوگوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ بغاوت کے الزام میں صہبائی کو گولی ماری گئی اور شیفتہ کو قید کی سزا ہوئی۔ اس ضمن میں G. ALLANA لکھتے ہیں:

DELHI WAS AT THIS TIME FAMOUS FOR ITS LITERARY SITTING AND POETRY EVENINGS, AND SYED AHMAD WAS A FREQUENT VISITOR TO THESE GATHERINGS, WHERE HE MET OUTSTANDING UNDER PEOPLE AND WRITERS, THE MOST NOTABLE OF WHOM WERE GHALIB AND MAULVI IMAM BUX SAHBAI. THE LATER WAS A FAMOUS POET AND SCHOLAR OF THE TIME AND WAS FOR SOME TIME IN THE DELHI COLLEGE. DURING THE REBELLION OF 1857, HE DIED THE DEATH OF A MARTYR, HAVING BEEN SHOT BY BRITISH SOLIDERS FOR HIS REVOULUTIONARY ACTIVITIES."(۱۷۹)

عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

"بغاوت کے الزام میں انہیں (صہبائی) اور ان کے خاندان کے تمام افراد کو گولی ماری گئی۔"(۱۸۰)

"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند" کے مصنف نے ایک انوکھی بات لکھی ہے:

"یہ (صہبائی) ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کالج سے تعلق کی بنیاد پر مارے گئے" (۱۸۱)۔

یہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو کالج انگریزوں کی نگرانی اور سرپرستی میں چل رہا ہو، اس سے تعلق کی بنا پر کیونکر مارے جائیں گے۔ اور صرف صہبائی ہی تن تنہا اس کالج سے متعلق نہ تھے بلکہ اور بھی بہت سارے مسلمان اس سے منسلک تھے۔ آخر صہبائی

ہی کیوں ہدف ستم بنے؟۔

دراصل بات یہ ہے کہ امام بخش صہبائی انگریز کی غلامی سے بیزار اور وطن کی محبت سے سرشار تھے اور یہی جذبہ وطنیت تھا کہ وہ فضل حق خیر آبادی جیسے وطن پرست مجاہد آزادی سے خوشگوار تعلقات رکھتے تھے۔ خوشگوار تعلقات کے لئے ذہنی ہم آہنگی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا گیا تو بہت سے علما نے اس کی تصدیق کی اور بعضوں نے مخالفت۔ فتویٰ جہاد کے حامیوں میں ایک نام صہبائی کا بھی آتا ہے۔ احمد سلیم کے بقول:

"جب دہلی کے گلی کوچوں میں جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی اور بازاروں میں لاشوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اگر اس وقت ایک طرف مخدوم شاہ محمود جیسے غدار عالم اپنے مرید کے ساتھ جہاد کے خلاف تھے تو دوسری طرف مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا جعفر تھانیسری، مولانا امام بخش صہبائی، مولوی تبارک علی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریا آبادی، مولوی احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی، مولانا فضل رسول بدایونی، مفتی انعام اللہ گویا، مولوی لطف اللہ علی گڑھی، فضل امام خیر آبادی، مولانا غلام قادر، قاضی فیض اللہ کشمیری، مولوی ابو سعید اور مولوی رضی اللہ جیسے سینکڑوں عالم اور فاضل ایسے تھے جو جنگ آزادی میں برابر کے شریک تھے (۱۸۲)۔"

"اور جب انگریزوں نے حامیان فتویٰ جہاد کے خلاف سخت کاروائی کرنی شروع کی تو صہبائی خانہ نشیں ہو گئے مگر زیادہ دیر تک کنج عزلت اور گوشۂ عافیت ان کو پناہ نہ دے سکا اور ۳۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پانچ ماہ کے محاصرہ کے بعد انگریزوں نے دلی فتح کر لی۔ مولانا صہبائی ایک دن محلہ کی مسجد میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ گورے مسجد میں گھس آئے اور سارے نمازیوں کے ساتھ

ان کو اور ان کے دونوں بیٹوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ چلتے چلتے محلّہ کے ۱۴ سو آدمی پکڑے اور سب کو جمنا کے کنارے لے جا کر گولی مار دی (۱۸۳) ۔اور لاشیں دریا میں پھنکوا دیں گئی۔ عورتوں کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچہ کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے (۱۸۴)۔ ان شہدا میں آفتاب ہند مولانا صہبائیؔ اور ان کے دونوں لڑکے تھے، جن کو نہ کفن نصیب ہوا نہ قبر۔" (۱۸۵)

ان شہدا کی صحیح تعداد کا علم نہیں البتہ صرف مولانا صہبائیؔ کے کنبہ کے ۲۱ افراد اس قطار میں مارے گئے (۱۸۶)۔" ان شہیدان وطن کا ایک زمانے نے ماتم کیا۔ مولانا کے قدر دانوں کو تو ان کی حسرت ناک شہادت کا بڑا قلق و رنج ہوا۔ چنانچہ مفتی صدر الدین آزردہؔ کو ان کی شہادت کی خبر ملی تو بے ساختہ پکار اٹھے ؎

کیوں کر آزردہؔ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہباؔئی ہو (۱۸۷)

لسان العصر اکبر الہ آبادی نے صہبائی کی شہادت پر اپنے جذبات کا اظہار اس انداز میں کیا ہے ؎

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور
مار دیں گولیاں پایا جسے کچھ زور آور
وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

"مرثیہ دہلی" میں حالیؔ کا یہ شعر قابل توجہ ہے ؎

مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز (۱۸۸)

مصور غم علامہ راشد الخیری نے اس سانحہ غم واندوہ کی تصویر نہایت موثر

انداز میں کھینچی ہے:

"مولانا قادر علی صاحب، مولانا کے حقیقی بھانجے تھے۔ اور ان ہی کے ساتھ ان کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک موقعہ پر بیان کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا۔ کہ گورے دن دن کرتے آپہنچے۔ پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ شہر کی حالت نہایت خراب تھی، اور دلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دے دی تھیں۔ اس لئے ہم گرفتار ہو کر دریا کے کنارے لائے گئے ابھی غدر کو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اور پھانسیوں کے بجائے باغی گولیوں کا نشانہ بنتے تھے۔ مسلم سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں۔ ہم تیس چالیس آدمی ان کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے، گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں، میں بہت اچھا تیراک تھا۔ مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہ جانتے تھے۔ اس لئے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔ لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا۔ اس لئے دریا میں کود پڑا۔ میں تیرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر گر کر مر گئے۔" (۱۸۹)

"سفینہ رحمانی" میں ان کی دردانگیز شہادت پر ایک مرثیہ ملتا ہے، ملاحظہ ہو

ندانم کجا رفت آن نعش پاک — فلک برد یا ماند برروی خاک
ندانم کہ کس داد اورا کفن — ویا ماند چون سایہ بر خاک تن

ندانم چہ کردست با او سپہر
زجامہ کفن کرد یا تاب مہر
بخاکش نمودند اورا نہان
ویا مرتفع شد سوی آسمان
کسی فاتحہ ھم برو خواندہ است
بعطر گلابی برافشاندہ است
کدامی گل وبلبل و باد دشت
بخاکش بحسن عقیدت گذشت
الٰہی بیامرز مظلوم را
کلاہ شہی دہ بہ ملک بقا
بفردوس اعلی بود جای او
بہشت برین باد ماوای او(۱۹۰)

یہ بڑا ہی دردناک اور پراثر مرثیہ ہے، جو صہبائی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ شاعر نے ایسی دلکش ودلفریب عکاسی کی ہے کہ سارا منظر آنکھوں میں اتر جاتا ہے۔ اس سے صہبائی کی بے بسی اور ان کی شہادت کی درد بھری تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس مرثیہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

"یہ مرثیہ اگرچہ فارسی میں ہے لیکن ایک ایسے ادیب کی یاد دلاتا ہے، جس نے جنگ آزادی کے سلسلے میں جام شہادت نوش کیا۔"(۱۹۱)

الغرض صہبائی کی زندگی کے دو رخ تھے۔ ایک ادبی اور دوسرا سیاسی۔ جہاں ایک طرف وہ ابتدا ہی سے درس وتدریس میں لگے ہوئے تھے اور دلی کالج کے ممتاز اور فاضل پروفیسر تھے۔ وہیں دوسری طرف سیاست ملکی میں بھی حصہ لے رہے تھے۔ انہوں نے کوچہ چیلاں کے دوسرے مجاہدین آزادی کی طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ اور ان کی یہ سرگرمی اس وقت ختم ہوئی جب وہ شہید کردیے گئے۔

حواشی:

۱۔ طبقات الشعرا ص ۳۶، گلستان سخن ص ۱۳۷، شمع انجمن ص ۳۲۶

۲۔ گلستان سخن ص ۲۳۳

۳۔ آثار الصنادید ص ۳۲۴

۴۔ خطبات گارساں دتاسی۔ چھٹا خطبہ ص ۱۸

۵۔ گلستان سخن ص ۲۳۳

۶۔ دیوان صہبائی ص ۴۶
۷۔ صہبائی ایک مختصر تعارف ص ۲۱
۸۔ دیوان صہبائی ص ۴۳
۹۔ طبقات الشعرا ص ۴۱۲
۱۰۔ اودھ کیٹلاگ ص ۱۹۰
۱۱۔ خطبات ص ۹۴
۱۲۔ مضمون نگاری ص ۲۱۸
۱۳۔ مسالک و منازل ص ۳۳۴ (فٹ نوٹ)
۱۴۔ امام بخش صہبائی ص ۳۵
۱۵۔ شرح نصیرای ہمدانی ص ۴۵
۱۶۔ ایضاً ص ۵۰
۱۷۔ غالب نامہ، جولائی ۱۹۸۱ء ص ۱۵۸
۱۸۔ طبقات الشعرا ص ۴۱۳
۱۹۔ اہل دہلی ص ۱۳۲
۲۰۔ صہبائی ایک مختصر تعارف ص ۳۲
۲۱۔ مسالک و منازل ص ۳۳۵
۲۲۔ شرح غزلیات غالب (فارسی) ۲/ ۶۳۸
۲۳۔ امام بخش صہبائی ص ۵۶
۲۴۔ آثار الصنادید ص ۶۳۰
۲۵۔ گلستان سخن ص ۱۳۷
۲۶۔ طبقات الشعرا ص ۴۱۳
۲۷۔ شمع انجمن ص ۳۲۶
۲۸۔ طبقات الشعرا ص ۴۱۴
۲۹۔ مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۲
۳۰۔ مفتاح التواریخ ص ۳۷۵
۳۱۔ ایضاً
۳۲۔ ایضاً ص ۳۹۴
۳۳۔ کلیات صہبائی (رسالہ نادرہ) ص ۶۲۹
۳۴۔ طبقات الشعرا ص ۴۱۶، مسالک و منازل ص ۳۳۷
۳۵۔ طبقات الشعرا ص ۴۱۶
۳۶۔ امام بخش صہبائی ص ۵۹
۳۷۔ کلیات صہبائی (مکتوب) ص ۱۴۵
۳۸۔ ایضاً ص ۱۵۴
۳۹۔ طبقات الشعرا ص ۴۱۶
۴۰۔ مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۰
۴۱۔ مسالک و منازل ص ۳۳۷
۴۲۔ آب حیات ص ۴۸۷
۴۳۔ امام بخش صہبائی ص ۶۲
۴۴۔ مرحوم دہلی کالج ص ۲
۴۵۔ کلیات شاہ نصیر ۱/۵۱
۴۶۔ مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۶

۴۷۔ آب حیات ص ۴۸۷ (آزاد کی اس تحریر میں چند باتیں غور طلب اور محل نظر ہیں۔ جس کی طرف ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے اپنی کتاب "صہبائی ایک مختصر تعارف" ص ۶۳ میں اشارہ کیا ہے)
۴۸۔ تاریخ ادب اردو
۴۹۔ نقش آزاد ص ۳۱۶
۵۰۔ غالب اور ابوالکلام ص ۱۸۷
۵۱۔ تصانیف احمدیہ جلد ۱ حصہ ۱ ص ۱۳۶
۵۲۔ غدر کے چند علما ص ۱۴
۵۳۔ خطبات ص ۱۸۹
۵۴۔ دہلی کی آخری شمع ص ۲۸
۵۵۔ سخن شعرا ص ۲۶، تذکرہ طور کلیم ص ۶۶، بزم سخن ص ۲۲
۵۶۔ سخن شعرا ص ۱۵۲، بزم سخن ص ۱۱۳
۵۷۔ ایضاً
۵۸۔ سخن شعرا ص ۱۸، ۱۵۰، ۱۹۲، ۳۰۴
۵۹۔ گلستان سخن ۱/ ۵۱۶
۶۰۔ صہبائی ایک مختصر تعارف ص ۲۲
۶۱۔ سخن شعرا ص ۳۰۴
۶۲۔ خم خانہ ۵/ ۴۴۱
۶۳۔ صہبائی ایک مختصر تعارف ص ۲۴
۶۴۔ دلی کی آخری بہار ص ۷۸
۶۵۔ حیات جاوید ۲/ ۴۵۰ (فٹ نوٹ)
۶۶۔ کلیات صہبائی ص ۱۱۵
۶۷۔ خم خانہ ۵/ ۵۸۵
۶۸۔ دلی کی آخری شمع ص ۸۰
۶۹۔ گلستان سخن ۲/ ۲۲
۷۰۔ خم خانہ ۴/ ۳۸۲
۷۱۔ قول فیصل ص ۱۶۸
۷۲۔ مقالات شیرانی ۳/ ۱۸۷
۷۳۔ ایضاً ۳/ ۱۸۸
۷۴۔ سیر المصنفین ۱/ ۲۳۴
۷۵۔ ماخذات ۱/ ۱۴۴
۷۶۔ گلستان سخن ص ۱۶۸، ماخذات ۱/ ۲۰۶
۷۷۔ ایضاً ص ۱۲۹، ایضاً ۲/ ۱۵۸
۷۸۔ ماخذات ۳/ ۹۹
۷۹۔ گلستان سخن ص ۱۴۶، ماخذات ۳/ ۳۶۷
۸۰۔ گلستان سخن ص ۱۴۷
۸۱۔ ایضاً ص ۱۵۴
۸۲۔ سخن شعرا ص ۶۶
۸۳۔ گلستان سخن ص ۱۵۷
۸۴۔ ترجمہ حدائق البلاغت ص ۷۹
۸۵۔ گلشن بیخار ص ۴۲

۸۶۔ گلستان سخن ص ۱۷۰

۸۷۔ ایضاً ص ۱۷۶

۸۸۔ ایضاً ص ۱۹۵

الف۔ کاملان رامپور ص ۱۵۵

۸۹۔ گلستان سخن ص ۲۰۵

۹۰۔ مقالات شیرانی ۱۸۷/۳

۹۱۔ ایضاً ۳۳/۳

۹۲۔ طبقات الشعراء ص ۴۶۷

۹۳۔ مقالات شیرانی ۱۸۷/۳

۹۴۔ قاموس المشاہیر ۲۴۵/۱

۹۵۔ گلستان سخن ص ۲۳۸

۹۶۔ گلستان سخن ص ۲۴۱

۹۷۔ خم خانہ ۴۷۸/۳

۹۸۔ دہلی کی آخری شمع ص ۲۴۶

۹۹۔ گلستان سخن ص ۲۴۵

۱۰۰۔ ایضاً ص ۲۵۵

۱۰۱۔ ایضاً ص ۲۶۳

۱۰۲۔ صہبائی ایک مختصر تعارف ص ۱۴۶

۱۰۳۔ گلستان سخن ص ۲۶۹

۱۰۴۔ خم خانہ ۳۸۲/۴

۱۰۵۔ گلستان سخن ص ۲۷۱

۱۰۶۔ ایضاً ص ۲۸۲

۱۰۷۔ دیوان ذوق ص ۲۵۱ (حاشیہ)

۱۰۸۔ دہلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ ص ۹

۱۰۹۔ دیوان ذوق ص ۲۵۰

۱۱۰۔ مقالات شیرانی ۱۸۸/۳

۱۱۱۔ گلستان سخن ص ۲۸۵

۱۱۲۔ ایضاً ص ۲۸۷

۱۱۳۔ ایضاً ص ۲۵۶

۱۱۴۔ ایضاً ص ۳۰۳

۱۱۵۔ ایضاً

۱۱۶۔ تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۷۴

۱۱۷۔ سخن شعراء ص ۳۰۴

۱۱۸۔ گلستان سخن ص ۳۵۴

۱۱۹۔ خم خانہ ۵۸۵/۵

۱۲۰۔ دلی کی آخری شمع ص ۸۰

۱۲۱۔ گلستان بے خزاں ص ۱۶۵

۱۲۲۔ گلستان سخن ص ۳۷۳

۱۲۳۔ گلستان سخن ص ۳۷۸

۱۲۴۔ ایضاً ص ۳۸۷

۱۲۵۔ ایضاً ص ۳۹۱

۱۲۶۔ تذکرہ کاملان رامپور ص ۲۶۲

۱۲۷۔ گلستان سخن ص ۳۹۱

۱۲۸۔ تاریخ ادبیات پاکستان و ہند ۲۳۷/۳

١٢٩۔ خم خانہ ۴/ ٢٨٣

١٣٠۔ آب حیات ص ۴١٠

١٣١۔ ایضاً

١٣٢۔ گلستان سخن ٢/ ٣٠٢

١٣٣۔ گلستان سخن ص ۴٠٩

١٣۴۔ صہبائی ایک مختصر تعارف ص ١۴٦

١٣۵۔ طبقات الشعرا ص ۴٦٢

١٣٦۔ گلستان سخن ص ۴١٢

١٣٧۔ قول فیصل ص ١٦٩

١٣٨۔ گلستان سخن ص ۴١٩

١٣٩۔ ایضاً ص ۴۵٣

١۴٠۔ اہل دہلی ص ١۴٨

١۴١۔ طبقات الشعرا ص ۴١٢

١۴٢۔ صحیفہ خوشنویساں ص ٢٠٢

١۴٣۔ صہبائی ایک مختصر تعارف ص ١۴۴

١۴۴۔ قاموس المشاہیر ٢/ ٢۵٦

١۴۵۔ گلستان سخن ص ۴٦٣

١۴٦۔ گلستان سخن ص ۴٦۵

١۴٧۔ اہل دہلی ص ١۴٨

١۴٨۔ گلستان سخن ص ۴٧٦

١۴٩۔ دفتر گم گشتہ: بہار میں اردو شاعری کا ارتقا ص ۵۵۵

١۵٠۔ یادگار غالب ص ٢٠١

١۵١۔ حیات جاوید ص ۵۴

١۵٢۔ ایضاً ص ٦٧٦

١۵٣۔ مقالات سرسید ص ٣٢٣

١۵۴۔ حیات جاوید ص ٧٣٠

١۵۵۔ ایضاً ص ٦٣

١۵٦۔ کلیات نظم غالب ص ١٠٩

١۵٧۔ مسالک و منازل ص ٣٦٦

١۵٨۔ دیوان صہبائی ص ٣٣

١۵٩۔ ایضاً ص ٣٨

١٦٠۔ ایضاً ص ٣۵

١٦١۔ ایضاً ص ٣٨

١٦٢۔ ایضاً ص ٢٣

١٦٣۔ غالب از مہر ص ۴٩٨

١٦۴۔ واقعات ٢/ ٨٧٠

١٦۵۔ آب حیات ص ۵٠۵

١٦٦۔ شرح غزلیات غالب (فارسی) ٢/ ٧٦٣

١٦٧۔ تحقیقی مضامین ص ٨۵

١٦٨۔ خطوط غالب از مہر ص ۵٣۴

١٦٩۔ ایضاً ص ١٦٢

١٧٠۔ گلستان سخن ص ٢۴١

١٧١۔ نگار، جلد ۴٢، فروری ١٩٦٣ء

١٧٢۔ رسالہ قواعد صرف و نحو اردو ص ٣٠٠

١٧٣۔ غدر کے چند علما ص ٣٥
١٧٤۔ دہلی کی جانکنی ص ٧٢
١٧٥۔ بہادر شاہ ظفر ص ٥٠
١٧٦۔ صہبائی ایک مختصر تعارف ص ٢٠٧
١٧٧۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما ص ٨٣
١٧٨۔ ١٨٥٧ء کے مجاہد ص ٩
١٧٩۔ Muslim political through the ages 1562-1947,p.113
١٨٠۔ نوائے آزادی ص ١٤
١٨١۔ تاریخ ادبیات پاکستان و ہند ٨/ ٩٣
١٨٢۔ ١٨٥٧ء اور آج ص ٧٣
١٨٣۔ ایضاً ص ٢٧٩
١٨٤۔ داستان غدر ص ١٧١
١٨٥۔ تحریک آزادی اور مسلمان ص ٨٠
١٨٦۔ دہلی کی جانکنی ص ٧٢
١٨٧۔ نوائے آزادی ص ١٤
١٨٨۔ ایضاً ص ١٨
١٨٩۔ دلی کی آخری بہار ص ٧٨
١٩٠۔ سفینہ رحمانی ص ٨٨
١٩١۔ اردو قومی شاعری کے سو سال ص ١١١

صہبائی کی تصانیف

اردو تخلیقات

امام بخش صہبائی کے علمی سرمایے میں زیادہ تر فارسی نگارشات ہیں۔ اسی زبان کی زلفیں سنوارنے اور گیسوؤں کو سلجھانے میں ان کی ساری عمر گذری۔ انہوں نے اس زبان کی ہر طرح سے آبیاری کی اور ہر قسم کے فن کے نوک پلک کو درست کیا۔ خواہ شرح نویسی کا میدان ہو یا تنقید نگاری، فن معما ہو یا انشا پردازی، مکتوب نگاری ہو یا عروض و قوافی کا فن، علم محاکمہ ہو یا موازنہ، تنقید ہو یا تحقیق۔ غرض ہر فن پر ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

اگرچہ صہبائی کی محبوب زبان فارسی تھی اور ہندستان کے ان چند ممتاز ترین فارسی دانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، جو ہندی نژاد ہونے کے باوجود ہزاروں فارسی دانوں میں اپنی لطافت بیان، ندرت ادا، جدت مضامین اور کلام میں پختگی کے باعث ممتاز اور نمایاں ہیں۔ لیکن بعض اہل کرم کی فرمائش پر اس ''آتش پارسی'' کے پجاری کو اردو زبان و ادب کی طرف بھی راغب ہونا پڑا۔ اور یہاں بھی انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت اور استادانہ مہارت سے کام لیتے ہوئے چند قیمتی، معیاری اور گرانقدر خدمات انجام دیں، جو آج بھی عظمت و وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ باوجودیکہ امام بخش صہبائی کی اردو خدمات صرف چند ہیں البتہ ان کے شاگردوں کی ایک لمبی فہرست ہے، جو اکثر ریختہ کہا کرتے تھے اور انہیں سے اصلاح سخن لیا کرتے تھے اور وہ بھی خوب اصلاح دیا کرتے تھے۔

عام طور پر ''ترجمہ حدایق البلاغت'' صہبائی کی پہلی اردو تصنیف مانی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری تصنیف ایسی نہیں ملتی ہے، جو اردو میں اس سے قبل کی ہو۔ لیکن اتنا طے ہے کہ انہوں نے اس کا ترجمہ پرنسپل بوترو کی فرمائش پر کیا تھا۔

چنانچہ پرنسپل بوتروکا صہبائی سے ''حدایق البلاغت ''کا ترجمہ کروانا، یہ ثابت کرتا ہے کہ اردو میں بھی ان کو دستگاہ کامل حاصل تھی اور کچھ چیزیں اس سے قبل اردو میں بھی آچکی تھیں۔ ورنہ کچھ نہ کچھ بنیاد ہونی چاہیے جس کی بنا پر ان سے ترجمہ کی فرمائش کی گئی۔ پرنسپل بوترو جیسا دانشور کسی مبتدی کو اتنا اہم کام نہیں سونپ سکتا۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اس ترجمہ میں صہبائی نے جو زبان اختیار کی ہے، وہ ان کے بعض معاصرین کے مقابلے میں زیادہ سلیس، رواں اور مدلل ہے۔ بظاہر ایسا شخص جو پہلی مرتبہ اردو لکھ رہا ہو ایسی صاف اور سلیس نثر نہیں لکھ سکتا۔ البتہ کوئی ٹھوس ثبوت ایسا دستیاب نہیں ہے، جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ''ترجمہ حدایق البلاغت'' صہبائی کی پہلی اردو کاوش نہیں ہے۔

تذکرہ نگاروں نے عام طور پر تین کتابیں، ترجمہ حدایق البلاغت، انتخاب دواوین اور قواعد صرف و نحو اردو صہبائی سے منسوب کی ہیں۔ گارساں دتاسی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''سب سے آخر میں قابل ذکر صہبائی کی تصانیف ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں: حدایق البلاغت، انتخابات نظم اور قواعد اردو۔''(۱)

ان تین کتابوں کے علاوہ دیوان خواجہ میر درد، آثار الصنادید از سر سید، گلستان سخن از مرزا قادر بخش صابر، گلستان بے خزاں از مرزا قطب الدین باطن اور گلدستہ نازنیناں از مولوی کریم الدین بھی صہبائی سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ذیل میں ان کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

ترجمہ حدایق البلاغت:

یہ میر شمس الدین فقیر دہلوی کی مایہ ناز تصنیف ''حدایق البلاغت'' مؤلفہ ۱۱۶۸ھ/ ۵۵۔۱۷۵۴ء کا اردو ترجمہ ہے۔ اپنے زمانے میں یہ نہایت اہم، قابل قدر اور

معتبر تصور کی جاتی تھی اور اس زمانے کی درسیات میں شامل تھی۔

امام بخش صہبائی جب دہلی کالج سے منسلک ہوئے تو پرنسپل بوترو نے اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر صہبائی سے اردو میں منتقل کرنے کی فرمائش کی۔ پرنسپل بوترو کی فرمائش کا پاس رکھتے ہوئے انہوں نے ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں آسان اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔

عروض و قوافی کے فن پر اردو میں یہ پہلی کاوش ہے۔ اس سے قبل اس فن پر کوئی کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔ جب یہ ترجمہ منظر عام پر آیا تو اتنا مقبول ہوا کہ پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور دوسرے ایڈیشن کی نوبت جلد ہی آگئی۔

اس ترجمہ کے مجموعی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ صہبائی کو اردو نظم و نثر اور اس کے رموز و نکات اور مسائل و معاملات سے کس قدر شغف تھا اور کس درجہ ان کے افکار میں بالیدگی اور نظر میں گہرائی اور گیرائی تھی۔ اس پر تفصیلی گفتگو آگے کی جائے گی۔

انتخاب دواوین مؤلفہ ۱۸۴۲ء:

اردو کے سلسلے میں صہبائی کی دوسری اہم خدمت، جو اولیت کا درجہ رکھتی ہے، "انتخاب دواوین" ہے۔ عرصہ تک صہبائی کی یہ کاوش نظروں سے اوجھل رہی۔ صرف تذکروں میں اس کا نام ملتا تھا۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف کافی تلاش و جستجو کے بعد اس اہم نسخہ کو ڈھونڈا بلکہ ذاتی محنت اور لگن سے اسے شائع بھی کرایا۔

اس میں اردو کے ۱۲ نمائندہ شعرا کے تراجم اور نمونۂ کلام شامل ہیں، یہ تذکرہ اگرچہ خامیوں اور کمزوریوں سے عاری نہیں پھر بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انیسویں صدی کے علم و ادب کی داستان صہبائی کے بغیر نامکمل ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس قسم کی پیش کش اس سے قبل

کسی نے نہیں کی۔ اس کتاب پر تفصیلی باتیں آگے ہوں گی۔

قواعد صرف و نحو اردو:

اردو کے باب میں صہبائی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ پرنسپل بوترو کی فرمائش پر انہوں نے اردو قواعد پر قلم اٹھایا اور اس کو چار ابواب اور ایک مقدمہ میں تقسیم کیا۔ مقدمہ میں اردو زبان کے آغاز وارتقاء سے بحث کی گئی ہے، جو تاریخی حیثیت سے قابل اعتنا اور لائق توجہ ہے۔

صہبائی کا امتیاز اور ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کا طریقہ تکلم واضح، صاف اور مدلل ہے۔ اور خصوصی توجہ کا باعث چوتھا باب ہے، جس میں روزمرہ، محاورات اور ضرب الامثال کو قدرے تفصیل و صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس تصنیف کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے کہ ضرب الامثال کی تشریح کا کام سب سے پہلے صہبائی نے کیا ہے۔ صہبائی اہل علم اور اہل زبان کی بول چال کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور لوگوں سے یہ توقع رکھتے تھے کہ اس کو عمل میں لایا جائے۔ اس کتاب کا تفصیلی جائزہ آگے لیا جائے گا۔

دیوان خواجہ میر درد:

یہ کتاب بھی صہبائی سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس نادر و کمیاب تصنیف کی اطلاع دیتے ہوئے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے لکھا ہے:

> "انہوں (صہبائی) نے دہلی کالج کے لئے خواجہ میر درد دہلوی کے اردو دیوان کو بھی مرتب کیا تھا۔ اور دہلی کالج کے مطبع ہی سے اس کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ دیوان درد کی اس نادر اشاعت کا ایک نسخہ ہارڈنگ لائبریری دہلی میں محفوظ ہے۔"۔ (۲)

ان چار کتابوں کے علاوہ چند اور کتابیں ہیں، جن کو صہبائی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو علمی و ادبی دنیا میں اردو کے مشہور مصنفین کی تصانیف کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ ذیل میں ان کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا جارہا ہے:

(۱) آثار الصنادید مؤلفہ سر سید:

"آثار الصنادید" سر سید احمد خاں مرحوم کی ایک شہرہ آفاق تصنیف ہے، جس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ سر سید ہی اس کے اصل مصنف ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ چنانچہ حالؔی نے اپنی مایہ ناز تصنیف "حیات جاوید" میں لکھا ہے کہ سر سید جب دہلی کی عمارتوں کی تحقیق کے سلسلے میں بیرون شہر جایا کرتے تھے تو صہبائی بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن بعض قد آور محققین، جن میں علامہ شبلی نعمانؔی سر فہرست ہیں، کا خیال ہے کہ اس کتاب کے بعض مقامات صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

> "سر سید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ "آثار الصنادید" کے بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں، جو انہوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے ہیں"۔ (۳)

جبکہ خواجہ الطاف حسین حالؔی جو سر سید پر ایک مأخذ و مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ "آثار الصنادید" تو اصلاً سر سید ہی کی کدو کاوش کا ثمرہ ہے۔ البتہ اس کے سب سے پہلے ایڈیشن کی عبارت صہبائی کی تحریر کردہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "آثار الصنادید" کا سب سے پہلا ایڈیشن، جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے وہ جیسا کہ سر سید خود اقرار کرتے تھے، مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔" (۴)

بعد کے محققین گراہم بیلی اور مولانا ضیاء احمد بدایونی بھی اسی کے قائل نظر

آتے ہیں۔ دونوں کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"آپ (صہبائی) نے سر سید کی آثار الصنادید اسی طرز (مسجع و مرصع) میں لکھی تھی، جسے بعد میں سر سید نے سادہ اور راست اردو میں لکھا۔" (۵)

"آثار الصنادید" کے بارے میں یہ مسلم ہے کہ اس کی عبارت سر سید کے دوست اور رفیق صہبائی کی نگارش رنگین کا نتیجہ تھی۔ بعد کو سر سید نے اس پر نظر ثانی کر کے سادہ طرز میں ڈھالا۔" (٦)

دراصل بات یہ ہے کہ جس زمانے میں سر سید کی یہ تصنیف منظر عام پر آئی۔ اس وقت کا عام مذاق یہی تھا کہ نثر میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جائے۔ چنانچہ اس وقت مسجع و مرصع عبارتیں ہی طرۂ امتیاز مانی جاتی تھیں۔ اس عمومی ذوق کا پاس رکھتے ہوئے سر سید نے صہبائی سے، جو ایسی نثر لکھنے میں ید طولی رکھتے تھے، خواہش ظاہر کی کہ "آثار الصنادید" کو اسی مسجع و مرصع لب ولہجہ میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ صہبائی نے اس کو اسی طرز میں ڈھالا۔ بعد کو سر سید نے نظر ثانی کر کے اسے آسان اور سہل اسلوب میں شائع کرایا۔

۲۔ گلستان سخن مؤلفہ مرزا قادر بخش صابر:

محققین کے مابین اس کتاب کے مصنف کے بارے میں بھی کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض حضرات اسے صہبائی کے شاگرد رشید مرزا قادر بخش صابؔر سے اور بعض حضرات اسے مرزا قادر بخش صابر کے استاد صہبائی سے منسوب کرتے ہیں۔ جو حضرات صہبائی کے حق میں ہیں، وہ غالؔب کی طرف منسوب کر کے ایسی باتیں لکھتے ہیں۔ ڈپٹی عبد الغفور نساخ لکھتے ہیں:

"صابر، مرزا قادر بخش --- تذکرہ گلستان سخن ان کے نام سے مشہور

ہے۔ لیکن حقیقت میں تذکرہ مذکور مولوی امام بخش صہبائی کا لکھا ہوا ہے
کہ عبارت اس کی، اس بات پر گواہی دیتی ہے۔"(۷)

یہی خیال انھوں نے قدرے فرق کے ساتھ اپنی دوسری کتاب "سخن شعرا" میں ظاہر کیا ہے:

"صابرؔ تخلص مرزا قادر بخش --- تذکرہ گلستان سخن ان کے نام سے مشہور ہے لیکن حقیقت میں تذکرہ مذکور مولوی امام بخش مرحوم کا لکھا ہوا ہے۔"(۸)

لالہ سری رام بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "گلستان سخن" صہبائی کی تصنیف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"گلستان سخن نے، جس کی تدوین مولانا امام بخش صہبائی نے کی اور مرزا قادر بخش صابرؔ نے اپنے نام سے چھپوایا، دہلی سے آگے قدم بڑھنے کو عار سمجھا۔"(۹)

اسی طرح "گلستان سخن" کے مقدمہ میں بشیرؔ کے حوالہ سے ایک تحریر ملتی ہے:

"گلستان سخن (۱۲۷۱ھ) مرزا صاحب کے نام سے ہے۔ مگر در حقیقت مولوی صہبائی کی تصنیف ہے۔ اس میں فارسی، اردو دونوں زبانوں کے شاعروں کا حال و مقال مندرج ہے۔"(۱۰)

قاضی عبدالودود بھی یہی مانتے ہیں کہ "گلستان سخن" صہبائی کی ہی تصنیف ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

"گلستان سخن جس کا ایک نام آثار المعاصرین بھی ہے۔ شعبان ۱۲۷۰ھ میں شروع ہو کر شوال ۱۲۷۱ھ میں تمام اور اسی سال منطبع ہوا۔ سرورق پر قادر بخش صابرؔ کا نام بہ حیثیت مصنف درج ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ

مرقوم ہے کہ اس کے عبارات صہبائی کی اصلاح سے مزین ہیں۔ غالبؔ ۱۲۸۲ھ کو ایک خط میں ذکا کو لکھتے ہیں "آپ مرزا صابرؔ کا تذکرہ مانگتے ہیں، غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہوگیا۔ اب ایک مجلد کہیں نظر نہیں آتا (اردوئے معلی ص ۲۸)۔ لیکن ایک قدیم تر خط میں شفقؔ کو لکھ چکے ہیں کہ "صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کرتا ہوں (ص ۲۲۱)۔ نساخؔ اور سری رام اسے صہبائی کی تصنیف بتاتے ہیں اور قرائن دلالت کرتے ہیں کہ یہ غالبؔ کے قول پر مبنی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مقدمے کے مطالب علمی اور تذکرے کی عبارت صہبائی کی ہے اور شعرا کے حالات اور اشعار دونوں (صہبائیؔ و صابرؔ) نے جمع کئے ہیں۔" (۱۱)

موجودہ دور کے ایک نامور محقق اور دانشور امتیاز علی خاں عرشی مرحوم، قاضی صاحب کی اس تحقیق سے متفق نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ دراصل تذکرے کے مصنف امام بخش صہبائی ہیں۔ اس قسم کی رائیں حسن ظن اور صاف دلی سے بعید اور پچھلے بزرگوں پر بغیر کسی دستاویزی شہادت کے سخت نکتہ چینی کا موجب ہیں۔ اس لئے میں اس کے ماننے پر آمادہ نہیں ہوں۔" (۱۲)

لیکن قاضی صاحب اپنی رائے پر اٹل ہیں اور اس کے برعکس سوچنے پر بھی راضی نہیں ہیں۔ وہ عرشی صاحب کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر دستاویزی شہادت سے صابر یا صہبائی کا اقرار نامہ مراد ہے تو یہ واقعی موجود نہیں ہے۔ لیکن غالبؔ، گلستان سخن کو صہبائی ہی کی تصنیف سمجھتے تھے۔ اور نساخؔ (سخن شعرا ص ۲۷۲) اور سری رام (دیباچہ / خم خانہ جلد ۲) کی بھی یہی رائے ہے۔" (۱۳)

قاضی عبدالودود نے اپنی تحقیق کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دلائل دیے ہیں:

(۱) غالبؔ گلستان سخن کو صہبائی کی تصنیف سمجھتے تھے۔

(۲) نساخؔ کی بھی یہی رائے ہے۔

(۳) لالہ سری رام بھی اس سے متفق نظر آتے ہیں۔

(۴) سرورق پر مرقوم ہے کہ اس کے عبارات صہبائی کی اصلاح سے مزین ہیں۔

قاضی صاحب کے یہ دلائل کہاں تک درست ہیں۔ آیئے ان کا جائزہ لیتے چلیں:

سب سے پہلی دلیل یہ ہے کہ "غالبؔ، گلستان سخن کو صہبائی کی تصنیف سمجھتے تھے"۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ غالبؔ کی جن عبارتوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ غالبؔ اس قسم کا خیال رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر ذکا اور شفقؔ کے نام غالبؔ کے خطوط کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ انوار الدولہ شفقؔ کے نام خط کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد میری ملک میں سے میرے پاس تھی۔ وہ اپنی طرف سے بہ سبیل ارمغان آپ کو بھیجتا ہوں، نذر قبول ہو" (۱۴)

سید مرتضیٰ حسین فاضل نے اس خط کا سال مکتوب ۱۸۵۶ء بتایا ہے۔ دوسرا حبیب اللہ خاں ذکاؔ کے نام ہے۔ عبارت یوں ہے:

"آپ مرزا صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا۔ اب ایک مجلد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔" (۱۵)

اس خط کا سال مکتوب ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۶ء ہے۔

ان دونوں خطوط سے اس قسم کی کوئی بات نہیں معلوم ہوتی کہ صہبائی کو گلستانِ سخن کا مؤلف بتایا گیا ہو۔ یہ باتیں اس صورت میں ہو سکتی تھیں کہ ان دونوں تذکروں

میں سے کوئی ایک موجود نہ ہوتا۔ اب جب کہ یہ بات سامنے آگئی ہے کہ صہبائی نے خود ایک تذکرہ تالیف کیا تھا اور صابر نے بھی اپنا ایک تذکرہ مرتب کیا تھا اور دونوں کتابیں متداول بھی ہیں۔ تو اب اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ یہ دونوں تذکرے دہلی میں ہی لکھے گئے۔ اس لئے یہ ضرور کہا جائے گا کہ غالب ان دونوں تذکروں سے واقف تھے۔ اگر واقف نہ ہوتے تو ذکا کو باخبر کرتے کہ صابر نے کوئی تذکرہ نہیں لکھا البتہ صہبائی کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس قسم کی باتیں نہیں ملتی ہیں۔

حیرت اس بات پر ہے کہ سید مرتضیٰ حسین فاضل نے بغیر تحقیق کیے غالب کے خطوط پر حاشیہ میں یہ رائے ظاہر کر دی کہ:

> "صہبائی کے تذکرے سے مراد ہے گلستان سخن۔ اکثر محققین حال اور معاصرین صہبائی و صابر کے خیال میں گلستان سخن صہبائی کی تالیف ہے(۱۶)"۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے قرائن ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ صہبائی کے تذکرے سے گلستان سخن مراد ہے۔ کیا اس سے "انتخاب دواوین" مراد نہیں لیا جا سکتا ہے۔ اگر واقعی غالب ایسا سمجھتے تو برملا اس کا اظہار کرتے اور ذکا کو صاف لکھ دیتے کہ صابر کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ ان دونوں خطوط میں غالب کے بیانات میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، جس سے مغالطہ ہو۔ اس لئے ان دونوں خطوط کو بنیاد بنانا کسی طرح درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ٹھیک ہی لکھا ہے:

> "دوسری شہادت غالب کی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان کے بیانات متضاد ہیں۔ ایک خط میں وہ ذکا کو لکھتے ہوئے گلستان سخن کو صابر کا تذکرہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے انھوں نے شفق کو جو خط لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں کہ "صہبائی کے تذکرے کی ایک جلد نذر کرتا ہوں۔" معلوم

نہیں اس مقام پر اس سے مراد گلستان سخن ہے یا صہبائی کے ''انتخاب دواوین'' کا ذکر کر رہے ہیں جو خود ایک تذکرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (۱۷)

اگر بفرض محال مان لیا جائے کہ غالب کی مراد گلستان سخن تھی۔ تو واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں مرزا قادر بخش صابر نے صہبائی کی تعریف و توصیف بڑے شاندار طریقے سے کی ہے۔ اور یہ بات غالب کو گوارہ نہیں تھی کہ ان کے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی جائے۔ خود قاضی صاحب بھی اس سے متفق ہیں کہ غالب جیسا انا پرست و خود غرض اس وقت کوئی نہ تھا۔ اس لئے انھوں نے یہ افواہ بہت زور و شور سے اڑائی ہو گی کہ ''گلستان سخن'' صہبائی کی تصنیف ہے۔ اور یہ افواہ پورے ہندستان میں پھیل گئی ہو گی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ نساخ بھی یہی مانتے ہیں کہ ''گلستان سخن'' کے مصنف دراصل صہبائی ہیں۔ تو اس سلسلے میں کہنا ہے کہ نساخ نے اپنا تذکرہ ۱۲۸۱ھ میں لکھا اور ۱۲۹۱ھ میں شائع کیا۔ یعنی صابر کے تذکرے کے دس سال بعد ''سخن شعرا'' تالیف کیا گیا اور بیس سال بعد شائع ہوا۔ اس لئے کسی بھی صورت میں اس کو معاصر تذکرہ نہیں کہا جا سکتا۔ جبکہ معاصر تذکروں جیسے سراپا سخن مؤلفہ ۱۲۶۹ھ، یادگار شعرا مؤلفہ ۱۲۶۹ھ، گلشن ہمیشہ بہار مؤلفہ ۱۲۷۱ھ، خوش معرکہ زیبا مؤلفہ ۱۲۶۲ھ، طبقات الشعرا مؤلفہ ۱۲۶۳ھ اور گلستان بے خزاں مؤلفہ ۱۲۶۱ھ میں اس قسم کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے۔ اگر ان تذکروں میں کوئی ایک تذکرہ بھی اس بات کا شاہد ہوتا تو نساخ کی بات میں وزن ہو سکتا تھا۔

تیسری دلیل کے بطور سر یرام کے بیان کو پیش کیا جاتا ہے تو اس ضمن میں یہ گوش گذار کرنا ہے کہ سر یرام بہت بعد کے ہیں۔ انہوں نے ۱۸۹۱ء/۱۳۰۹ھ میں مواد جمع کرنا شروع کیا اور اس کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں منظر عام پر آئی۔ اس لئے ان کے بیان کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی ہے۔ جبکہ انہوں نے اپنے کسی ماٰخذ کی نشاندہی بھی نہیں

کی ہے۔ گمان غالب ہے کہ انہوں نے نساخ سے استفادہ کیا ہو۔ اس صورت میں ان کا بیان محض تقلیدی یا اضافی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح بہاء الدین بشیر کا بیان بھی نساخ سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں کے بیانات لفظاً و معناً ایک ہیں۔ اور پھر یہ کہ وہ صابر کے معاصرین میں بھی نہیں ہیں۔ اس لئے اس مسئلے کے حل میں ان دونوں کے بیانات کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی ہے۔ قاضی صاحب کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ گلستان سخن کے ۔ ورق پر مرقوم ہے کہ "اس کے عبارات صہبائی کی اصلاح سے مزین ہیں"۔ تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس پر دال ہو کہ اصل مصنف صہبائی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی نظر صابر کے دیباچہ اور خاتمہ پر نہیں پڑی۔ دونوں جگہ صابر نے صہبائی کی رہنمائی کا برملا اعتراف کیا ہے۔ دیباچہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

> "جناب افادات مآب مولوی امام بخش صہبائی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پیش نہاد کو عرض کیا اور مکرر معروض ہوا کہ سرانجام اس امر دشوار کا کم استعداد سے معلوم۔ اگر کمترین تلامذہ کی تحریر خلعت اصلاح سے مشرف ہو جایا کرے تو یہ مشکل آسان ہو جاوے --- بارے عرض نیاز شعار کی زیور قبول سے آراستہ ہوئی اور حلیہ اجابت سے پیراستہ۔ شفقت استاد پر نازاں ہوں کہ ہر چند رفتار قلم سعی فکر سے شتاب رو تر تھی اور شب و روز کی محنت اور شام و سحر کی کوشش سے جزو کے جزو فراہم ہو کر اس شاگرد نواز کی نگاہ عاطفت سے کمال تدقیق نظر اور تعمق فکر کے ساتھ گزرتے تھے۔ لیکن اس تحمل مشقت پر جبیں میں چیں اور ابرو میں شکنج کا نام نہ تھا۔ اور اب تک جمازہ قلم کی سیر لا ینقطع ہے۔ عالم الغیب آگاہ ہے کہ اس دشت ناپید اکنار کی نہایت کب نظر آوے اور اس بحر ذخار کا ساحل کب پایا جاوے۔ شفقت شاگرد پروری سے امید ہے کہ اس شاہد دل

ربا کا قامت حلیۂ اصلاح سے ایسا آراستہ ہو کہ نازک نہالان چمن حسن اس کی غیرت سے برگ خزاں سے پژمردہ تر ہو جاویں اور شمع رویان نرم جمال اس کے رشک سے نقاب خجالت میں منہ چھپاویں"۔ (۱۸)

اب ذرا خاتمہ کی عبارت بھی ملاحظہ فرمائیں، جہاں صہبائی کے علاوہ دوسرے معاونین کا شکریہ ادا کیا گیا ہے:

"جناب مستطاب استادی مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے آفتاب کی فروغ بخشی کا تو کیا بیان --- شاہدان عبارت کو اس طرح زیور اصلاح سے آرائش دی کہ ان دلرباؤں کی گردن و گوش کا جلوہ اس پیرایہ و حلل کے پردے میں نظر تامل سے روپوش ہو گیا ہے، گویا ایک سایہ تھا کہ ہجوم انوار میں محو ہو گیا۔" (۱۹)

کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف میں صہبائی کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بھی ہاتھ تھا۔ جب ایسا نہیں ہے تو صہبائی کی طرف نسبت کرنا بے معنی ہے۔ اور ہمارے ادب کی تاریخ میں ایسی بہت ساری مثالیں مل جاتی ہیں کہ مصنف نے بعض حضرات کی رہنمائی کا کھل کر اعتراف کیا ہے لیکن کوئی اس کو اس کا مصنف نہیں سمجھتا ہے۔ نیز بعض کتابیں اور مقالات ایسے بھی ہیں جو دراصل دوسروں کے ہیں لیکن چونکہ اس پر اس کا نام نہیں، اس لئے اس کی تصنیف نہیں سمجھا جاتا ہے۔ "آثار الصنادید" ہی کو لے لیجئے۔ آج کوئی بھی اس کو صہبائی کی تصنیف ماننے کو تیار نہیں جبکہ شبلی اور حالی اس کے مؤید ہیں۔ اسی طرح گلدستہ نازنیناں مؤلفہ مولوی کریم الدین، جس میں مولف نے نقل کی حد تک صہبائی کے تذکرہ انتخاب دواوین سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن آج کوئی بھی اس کو صہبائی کی تصنیف نہیں مانتا، تو صابر نے کیا خطا کی تھی کہ ان کو تختہ دار پر لٹکایا جا رہا ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو صہبائی ضرور اس کا اشارہ دیتے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے درست ہی لکھا ہے:

"گلستان سخن صرف یہی نہیں کہ صہبائی کی رہنمائی میں لکھا گیا بلکہ صہبائی کی زندگی ہی میں ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں شائع بھی ہو گیا۔ اگر صہبائی اسے اپنی تصنیف سمجھتے تھے تو انہوں نے زبانی یا تحریری کسی جگہ اس کا دعویٰ کیوں نہیں کیا اور اسے صابرؔ کے نام سے کیوں شائع ہونے دیا۔" (۲۰)

یہ حقیقت ہے کہ "گلستان سخن" کی تزئین واصلاح میں صہبائی کا غیر معمولی دخل رہا ہے اور خود مرزا قادر بخش صابرؔ نے اس کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ کیا تزئین واصلاح سے اصل مصنف کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو بہت سے شعرا جن کے اشعار کی اصلاح میں استادان فن کا زبردست ہاتھ رہا ہے، انہیں کی طرف منسوب ہوتے نہ کہ اصل شاعر کی طرف۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے صہبائیؔ و صابر اور دوسرے تذکروں کا تقابلی مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"تذکرے کا اصل متن (جس میں شاعروں کا حال ہے) تحریر کے وقت تک کئی مرحلوں سے گزر چکا تھا اور اس کا ابتدائی خاکہ، گمان غالب ہے کہ صابرؔ ہی کا تیار کردہ ہے۔ نظر ثانی میں کہیں کہیں استاد صہبائیؔ نے ترمیم کی ہو تو تعجب نہیں ورنہ شعرائے اردو کے بارے میں صابرؔ اور صہبائی کے خیالات میں بین فرق موجود ہے۔ انتخاب دواوین میں صہبائی نے بعض معاصر شاعروں کو بھی شامل کیا ہے اور ان کے حالات لکھ کر کلام کے بارے میں اپنی رائے دی ہے۔ یہ رائے صابرؔ کی درج کردہ آرا سے مختلف ہے" (۲۱)

پھر دونوں تذکروں کا مقابلہ و موازنہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

"گلستان سخن کے یہ اقتباسات شعرا کے بارے میں زیادہ لفظی اور گہری معلومات کے علاوہ انتخاب دواوین کی بیان کردہ آرا سے مختلف بھی

ہیں خصوصاً ممنونؔ اور ناسخؔ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار ہوا ہے وہ صہبائی کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہیں اور اس بدلے ہوئے ذوق کی نمائندگی کرتے ہیں جو صابرؔ اور اسی عمر کے بعض دوسرے نقادان فن کی ہاں جلوہ گر ہے۔ گلستان سخن میں شعرا کے حالات و کوائف بھی صہبائی سے جداگانہ ذوق کے آئینہ دار ہیں۔اب ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ گلستان سخن کا اصل متن صہبائی کی اصلاح سے مزین تو ہوگا لیکن صابرؔ کا اپنا تالیف کردہ ہی سمجھنا چاہئے۔ ہاں دونوں کے اسلوب میں مشابہت کا سبب ضرور ہے اور اسلوب کی مشابہت اصلاح ہو سکتا ہے لیکن نفس مضمون استاد اور شاگرد کا جدا ہے۔"(۲۲)

ان حقائق اور مباحث کی روشنی میں یہ طے ہو جاتا ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب کی تحقیق مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ انہوں نے حقائق کو نظر انداز کر ناسخؔ کی باتوں کو تسلیم کر لیا حالانکہ خود ناسخؔ کے بیانات بھی حقیقت سے پرے نظر آتے ہیں۔ موجودہ دور کے محققوں میں صرف قاضی عبدالودود ہی ایسے ہیں، جو اس کو تسلیم کرتے ہیں جب کہ دوسرے محققین مثلاً امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری جیسے جید محققین اس کے حق میں نہیں ہیں کہ گلستان سخن کو صہبائی کی تصنیف مانی جائے۔

۳۔ گلستان بے خزاں مؤلفہ میر قطب الدین باطنؔ:

میر قطب الدین باطنؔ، صہبائیؔ کے معاصر تھے۔ انہوں نے آگرہ میں ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء میں شیفتہ کے تذکرہ "گلستان بے خار" کے جواب میں "گلستان بے خزاں" کی تصنیف کی۔ اس کے متعلق پروفیسر گیان چند جین کا خیال ہے کہ صہبائی کی تصنیف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مرزا قطب الدین باطنؔ نے تذکرہ گلستان بے خزاں عرف نغمہ عندلیب لکھا۔ مشہور ہے کہ یہ تذکرہ مولانا امام بخش صہبائی کی تصنیف ہے۔" (۲۳)

پروفیسر موصوف کو شبہ ہو گیا ہے اور وہ گلستان سخن کو گلستان بے خزاں سمجھ بیٹھے۔ ورنہ ایسی کوئی روایت نہیں ملتی ہے، جس میں گلستان بے خزاں کو صہبائی کی تصنیف کہا گیا ہو۔ اس کے علاوہ انتخاب دواوین کے مقابلے میں تذکرہ باطن کی زبان زیادہ رنگین، پیچیدہ اور مصنوعی ہے۔

۴۔ گلدستہ نازنیناں مؤلفہ مولوی کریم الدین:

یہ تذکرہ گرچہ صہبائی کی تصنیف نہیں ہے لیکن صہبائی کے تذکرہ "انتخاب دواوین" سے مستفاد ضرور ہے۔ مولوی کریم الدین نے اپنے کسی ماٰخذ کی نشاندہی تو نہیں کی ہے البتہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تحقیق یہ ہے کہ "آغاز شاعری سے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ انتخاب دواوین سے ماخوذ ہے۔ یہی نہیں بعض شعرا کے تراجم کا بیشتر حصہ حرف بہ حرف صہبائی کے تذکرہ سے لیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ صہبائی نے صرف ۱۲ ممتاز شاعروں کا انتخاب کلام دیا ہے اور کریم الدین نے چند شعرا و شاعرات کا اضافہ کر کے ان کی تعداد ۷۳ کر دی" (۲۴)۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ کریم الدین نے نقل کی حد تک صہبائی کے تذکرہ سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن پروفیسر عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی مرحوم اس سے متفق نظر نہیں آتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فرمان فتحپوری کا یہ انکشاف کہ یہ (گلدستہ نازنیناں) سراسر "انتخاب دواوین" سے ماخوذ ہے۔ ناقابل اعتبار ہے۔" (۲۵)

پروفیسر عطاؔ کاکوی کے جواب میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

"میں نے سراسر، کہیں نہیں لکھا۔ یہ عطا کاکوی نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ باقی باتیں میں نے دونوں تذکروں کے تقابلی مطالعے کے بعد کہی تھیں--- بہر حال صہبائی اور کریم الدین کے تذکروں میں مشترک شعرا کے تراجم اور مقدمات میں عجیب و غریب مشابہت ہے۔ قرائن یہ بتاتے ہیں کہ کریم الدین نے صہبائی سے فائدہ اٹھایا ہے۔(۲۶)

ڈاکٹر احمر لاری بھی اس سے متفق نظر آتے ہیں کیونکہ انہوں نے ڈاکٹر فرمان فتحپوری پر کوئی نقد و تبصرہ نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی قابل اعتراض بات ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کی بات نقل کرنے کے بعد خاموشی اختیار نہیں کرتے۔ یہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ڈاکٹر احمر لاری بھی ان محققوں میں ہیں جو "گلدستہ نازنیناں" کو "انتخاب دواوین" سے مستفاد مانتے ہیں۔(۲۷)

یہ تو خارجی باتیں ہوئیں۔ جب داخلی شہادت موجود ہو تو خارجی کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کریم الدین نے بھی اپنی اس کتاب کا نام "انتخاب دواوین" رکھا تھا۔ چنانچہ گلدستہ نازنیناں کے سرورق پر یہ فقرہ موجود ہے کہ:

"الحمد للہ کہ کتاب "انتخاب دواوین" مطبع رفاہ عام دہلی میں مطبوع ہوا"

لیکن دیباچہ میں "گلدستہ نازنیناں" نام قرار دیا ہے۔ جبکہ طبقات الشعرا کے دیباچہ میں بھی "انتخاب دواوین" ہی اس کا نام دیا گیا ہے۔

دوسری بات جو سب سے اہم اور بنیادی ہے کہ مشترک شعرا کے حالات، جو دونوں تذکروں میں ہیں۔ اس میں نقل کی حد تک مشابہت پائی جاتی ہے، جس سے سرقہ کا گمان ہوتا ہے۔ اب رہا کہ سرقہ کس نے کیا ہے تو یہ طے ہے کہ صہبائی نے نہیں کیا ہے۔ کیونکہ صہبائی کا تذکرہ ۱۸۴۲ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا اور کریم الدین نے ۱۸۴۴ء میں مرتب کیا اور ۱۸۴۵ء میں طبع کروایا۔ اس صورت میں

بہائی پر تو سرقہ کا گمان ہو ہی نہیں سکتا ہے لہذا یہ الزام کریم الدین کے سر جاتا ہے۔
دونوں تذکروں کا تقابلی مطالعہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

انتخاب دواوین

شمس ولی اللہ: شمس ولی اللہ جراتی کہ نہایت مشہور شعراء دکھن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالم گیر اورنگ زیب کے میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والا جاہ نے اس کی قدردانی کر کے پرورش فرمائی۔ یہ شخص اول شعرا دکھن سے ہے کہ جس نے زبان دکھنی میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے۔ اور بعض کا یہ بھی مذہب ہے کہ زبان اردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے۔ (ص ۸۰)

خواجہ میر درد: دردؔ تخلص، خواجہ میر نام، فرزند لائق خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ تخلص کے ہے۔ مذہب ان کا صوفی تھا۔ علم موسیقی اور فن شاعری میں بہت اچھی دست قدرت رکھتے تھے۔ اور ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو محفل راگ کی ان کے ہاں منعقد ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ

گلدستہ نازنیناں

ولی: شمس ولی اللہ گجراتی کہ نہایت مشہور شعرا دکھن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالم گیر اورنگ زیب کے میں وارد دہلی ہوا اور شاہ والا نے اس کی قدردانی کر کے پرورش فرمائی۔ یہ شخص اول شعرائے دکھن سے ہے۔ کہ جس نے زبان دکھنی میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے اور بعضے کا یہ مذہب ہے کہ زبان اردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے۔ (ص ۳۵)

دردؔ: دردؔ تخلص خواجہ میر صاحب نام کا ہے۔ یہ صاحب فرزند لائق خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ تخلص کے تھے۔ مذہب ان کا حنفی، صوفی --- علم موسیقی اور فن شاعری میں بہت اچھی دست قدرت رکھتے تھے --- اور ہر مہینے کی ۲۴ تاریخ کو محفل راگ کی ان کے

ان کے خاندان میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ میاں ناصر احمد ہر مہینے کی چوبیسویں کو بین بجاتے ہیں اور کچھ گاتے بھی ہیں۔ غرض کہ خواجہ علیہ الرحمہ نے گیارہ سے (سو) ناویں ہجری میں اس دنیاے دوں سے رحلت فرمائی۔ یہ چند اشعار ان کے دیوان سے بطور یادگار کے انتخاب ہوئے۔(۹۶)

سودا: سودا تخلص، مرزا رفیع نام، اصل اور جائے ولادت اس کی شاہ جہاں آباد۔ ایام جوانی میں لکھنؤ کو گیا۔ اور وہائیں انتقال کیا۔ وزیر الممالک نواب آصف الدولہ کے مقربین میں سے تھا۔ شعر اس کا بہت خوب ہوتا تھا مگر باب مدح اور قدح میں اس کے سامنے انوری کی عقل کا چراغ بھی گل تھا۔ اس کا نام ہی دلالت کرتا ہے اس بات کی تصدیق پر کہ کالے کے روبرو چراغ نہیں جلتا۔ طبیعت اس کے کلام سے بہت خوش ہوتی ہے۔ الغرض کہ استاد مسلم الثبوت تھا۔ یہ چند ابیات اس کے دیوان سے انتخاب ہوئیں۔(ص ۱۳۰)

ہاں منعقد ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ان کے خاندان میں اب تک یہ رسم جاری ہے کہ میاں ناصر احمد ہر مہینے کی ۲۴ کو بین بجاتے ہیں اور کچھ گاتے بھی ہیں--- غرضیکہ خواجہ علیہ الرحمہ گیارہ سے (سو) ننانویں ہجری میں اس دنیاء دوں سے رحلت فرمائی ۔ یہ چند اشعار ان کے دیوان سے بطور یادگار انتخاب ہوئے۔ (ص ۲۳)

سودا: سوداؔ تخلص، مرزا رفیع نام، اصل اور جائے ولادت اس کی شاہ جہاں آباد۔ ایام جوانی میں لکھنؤ کو گیا اور وہاں ہی انتقال کیا۔ وزیر الممالک آصف الدولہ کے مقربین میں سے تھا۔ شعر اس کا خوب ہوتا تھا۔ مگر باب مدح اور قدح میں اس کے سامنے انوریؔ کی عقل کا چراغ بھی گل تھا۔ اس کا نام ہی دلالت کرتا ہے اس بات کی تصدیق پر کہ کالے کے روبرو چراغ نہیں جلتا۔ طبیعت اس کے کلام سے بہت خوش ہوتی ہے۔ الغرض کہ استاد مسلم الثبوت تھا۔ یہ چند ابیات اس کے دیوان سے انتخاب

میر تقی: میر تخلص، محمد تقی نام، رہنے والا اکبر آباد کا، بھانجا نواب سراج الدین علی خاں آرزو کا ہے۔ ابتدائے حال میں شاہ جہاں آباد میں آیا ---(ص ۱٦۷)

جرأت: جرأت تخلص، قلندر بخش نام، سلسلہ اس کے نسب کا راے مان محمد شاہی تک پہنچتا ہے۔ جن کو کہ نادر شاہ کے جلادوں نے گرفتار کر کے مار ڈالا۔ علم موسیقی میں بھی دست قدرت حاصل تھی۔ مگر ستار نواز خوب تھا اور منجم بھی تھا۔ ابتدائی عمر میں اندھا ہو گیا۔ خوب صورتوں اور گانے والیوں کے ساتھ بہت رہتا تھا۔ ایک مدت ملازم درگاہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر شاہ عالم بادشاہ کے ہاں رہا۔ مصحفی اور انشاء اللہ خاں سے مقابلہ کیا کرتا تھا۔ قریب تیس برس کے گذرتے ہیں کہ اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ نہایت صنعت کار تھا اور اکثر اشعار ان معاملات کے کہتا جو کہ درمیان عاشق و معشوق کے ہوتے ہیں۔ بطور یادگار یہ چند اشعار اس کے دیوان

ہوئیں۔(ص ۲۴)

میر: میر تخلص---- محمد تقی نام--- یہ شاعر خواہر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو کا ہے--- دارالخلافہ شاہ جہاں آباد میں اولاً ابتدائے حال میں آیا---(ص ۲۴)

جرأت: جرأت تخلص، قلندر بخش نام، سلسلہ اس کے نسب کا رایمان محمد شاہی تک پہنچتا ہے، جس کو کہ بادشاہ کے جلادوں نے گرفتار کر کے مار ڈالا۔ علم موسیقی میں بھی دست قدرت تھی مگر ستار نواز خوب تھا اور منجم بھی تھا۔ ابتدائی عمر میں اندھا ہو گیا۔ خوب صورتوں اور گانے والیوں کے ساتھ بہت رہتا تھا۔ ایک مدت ملازم درگاہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر بن عالم شاہ بادشاہ ہندوستان کے ہاں رہا۔ مصحفی اور انشاء اللہ خاں سے مقابلہ کیا کرتا تھا۔ قریب بتیس برس گذرتے ہیں کہ اس جہان فانی سے انتقال کیا۔ نہایت صنعت کار تھا اور اکثر اشعار ان معاملات کے کہا جو کہ درمیان عاشق اور معشوق کے ہوتے ہیں۔ بطور یادگار یہ

سے انتخاب کیے۔ (ص ۱۹۹)

نصیر: شاہ نصیر الدین نصیر تخلص عرف میاں کلو ولد شاہ غریب کہ مشاہیر دہلی سے تھا۔ بلکہ بہت سے شاعران زبان اردو ساکنین دہلی اسی مغفور سے تلمذ ریختہ گوئی کا کرتے تھے۔ اور یہی صاحب عالمِ حیات میں اپنے تئیں مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقیؔ پر فائق سمجھتے تھے۔ بہر کیف ریختہ گوئی میں دست قدرت اچھی رکھتے تھے۔ اواخر عمر میں دہلی سے حیدر آباد دکھن مہاراجہ حاتم وقت راجہ چندولال کی خدمت میں مشرف ہوئے اور وہیں اس جہان فانی سے رحلت کی۔ یہ چند اشعار بطور یادگار تذکرہ مصنفہ حکیم فاضل وافضل اعنی میر قدرت مرحوم تخلص قاسمؔ سے اور اور جاے سے لیے گئے ہیں۔ (ص ۲۴۸)

ممنون: ممنونؔ تخلص، نظام الدین نام، بیٹا سید قمر الدین منتؔ تخلص کا ہے۔ اس کا اصل قصبہ سونی پت اور مولد و منشا شاہ جہاں آباد۔ کسب فنون اپنے والد

چند اشعار اس کے دیوان سے انتخاب کیے۔ (ص ۲۷)

نصیر: شاہ نصیر، تخلص نصیرؔ، عرف میاں کلو ولد شاہ غریب کہ مشاہیر شعراے دہلی تھا۔ بلکہ بہت سے شاعران زبان اردو ساکن دہلی اسی مغفور سے تلمذ ریختہ گوئی کا کرتے تھے اور یہی صاحب عالمِ حیات میں اپنے تئیں مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقیؔ پر فائق سمجھتے تھے۔ بہر کیف ریختہ گوئی میں دست قدرت اچھی رکھتے تھے۔ اور آخر عمر میں دہلی سے حیدر آباد دکھن مہاراجہ حاتم وقت راجہ چندولال کی خدمت میں مشرف ہوئے۔ اور وہیں اس جہان فانی سے رحلت کی۔ یہ چند اشعار بطور یادگار تذکرہ مصنفہ حکیم وافضل المعنی میر قدرت اللہ مرحوم تخلص قاسمؔ سے اور ایک دیوان سے لیے گیے۔ (ص ۳۵)

ممنون: ممنونؔ تخلص، نظام الدین نام، بیٹا سید قمر الدین منتؔ تخلص کا ہے۔ اس کی اصل سونی پت اور مولد و منشا شاہ جہاں آباد۔ کسب فنون اپنے والد

بزرگوار سے گیا۔ مدت تک لکھنؤ میں رہا اور ایک زمانہ جرگہ شعرا پایہ تخت حضور والا کے تھا۔ چنانچہ پیشگاہ خلافت سے فخر الشعرا خطاب عطا ہوا۔ من بعد ضلع اجمیر میں پیش گاہ کمپنی بہادر سے عہدہ صدر الصدوری پر مختار رہا۔ مگر آج کل بباعث ضعف اعضا اور بینائی کے خانہ نشیں یعنی شاہ جہاں آباد وارد ہے۔ اس کے کلام کی طرز نہایت دلچسپ اور شیریں ہے۔ غرض کہ گلشن فصاحت کا بلبل ہزار داستان اور چمن بلاغت کا طوطی شکر فشاں ہے۔ اس واسطے یہ چند اشعار بطور نمونہ کے اس کے دیوان سے انتخاب ہوئے۔ (ص ۲۶۴)

ناسخ: ناسخ تخلص، شیخ امام بخش نام، لکھنوی، تمام عمر لکھنؤ میں بسر کی۔ ایک دفعہ وہاں کے حاکم سے کچھ رنجیدہ ہو کر الہ آباد چلا گیا۔ پھر وہاں سے کانپور میں آیا۔ بعد اس کے زمانہ جو موافق ہوا وطن میں پھر گیا۔ اب دو تین برس ہوئے کہ اس جہان فانی سے طرف عالم جاودانی کے رحلت کی۔ الغرض کہ ناسخ، ناسخ تھا شعرائے سلف کا۔ یہ تھوڑے سے

بزرگوار سے گیا۔ مدت تک لکھنؤ میں رہا۔ اور ایک زمانہ جرگہ شعرا پایہ تخت حضور والا کے تھا۔ چنانچہ پیش گاہ خلافت سے فخر الشعرا خطاب عطا ہوا۔ من بعد ضلع اجمیر میں پیش گاہ کمپنی بہادر سے عہدہ صدر الصدوری پر ممتاز رہا۔ وفات اس کی کو تخمیناً عرصہ چار مہینے کا ہوا۔ اس کے کلام کی طرز نہایت دلچسپ اور شیریں ہے۔ غرض کہ گلشن فصاحت کا بلبل ہزار داستان اور گلبن بلاغت کا طوطی شکر فشاں۔ اس واسطے یہ چند اشعار بطور نمونہ اس کے دیوان سے منتخب ہوئے۔ (ص ۳۴)

ناسخ: ناسخ تخلص، شیخ امام بخش نام، لکھنوی، تمام عمر لکھنؤ میں بسر کی۔ ایک دفعہ وہاں کے حاکم سے کچھ رنجیدہ ہو کر الہ آباد چلا گیا۔ پھر وہاں سے کانپور میں آیا۔ بعد اس کے زمانہ جو موافق ہوا وطن میں پھر گیا۔ اب دو تین برس ہوئے کہ اس جہان فانی سے طرف عالم جاودانی کے رحلت کی۔ الغرض کہ ناسخ، ناسخ تھا شعرائے سلف کا۔ یہ تھوڑے سے

شعر اس کے دیوان سے انتخاب کیے گیے۔ (ص ۲۸۶)

ذوق: ذوق تخلص، شیخ محمد ابراھیم نام، دہلوی، خطاب خاقانی ہند ہے۔ تیس برس کے عرصہ سے ملازم درگاہ حالت ولی عہدی سے شاہ حال دہلی کے ہیں اور فن شعر میں بھی ابتدائے عمر سے معروف ہیں۔ اب اس زمانے میں خصوصاً دہلی میں کوئی ان کے مقابلے کا نہیں ۔ اکثر مشاعروں میں اس کی آتش زبانی کے آگے اور شعرا مثل خس و خاشاک کے جلتے ہیں۔ اور اس کے الفاظ برجستہ کے رشک سے جب کہ وہ محفل مشاعرہ میں غزل پڑھتا ہے، شرمندہ ہو کر بے تابانہ کف افسوس ملتے ہیں۔ لہذا یہ چند اشعار جو ایک بیاض میں تھے بطریق یادگار لکھے جاتے ہیں۔ (ص ۳۲۲)۔

اشعار اس کے دیوان سے انتخاب کیے۔ (ص ۳۲)

ذوق: ذوق تخلص، شیخ محمد ابراھیم دہلوی المخاطب بہ خاقانی ہند ہے --- اب اس زمانے میں خصوصاً دہلی میں ان کے مقابلے کا نہیں۔ اور اکثر مشاعروں میں اس کی آتش زبانی کے آگے اور شعرا مثل خس وخاشاک کے جلتے ہیں۔ اور اس کے الفاظ برجستہ کے رشک سے جب کہ وہ محفل مشاعرہ میں غزل پڑھتا ہے شرمندہ ہو کر بے تابانہ کف افسوس ملتے ہیں، بتیس برس کے عرصہ سے ملازم درگاہ حالت ولی عہدی سے شہنشاہ دہلی کے ہیں۔ اور فن شعر میں ابتدائے عمر سے مصروف ہیں۔ یہ چند اشعار جو ایک بیاض میں تھے بطریق یادگار لکھے جاتے ہیں (ص ۲۷)

اس تفصیلی تقابلی مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کریم الدین نے صہبائی کے تذکرے سے نقل کی حد تک استفادہ کیا ہے اور بعض مقامات پر تو ان سے فاحش غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ مثلاً ناسخ کی وفات کے سلسلے میں صہبائی نے لکھا کہ:

"اب دو تین برس ہوئے کہ اس جہان فانی سے طرف عالم جاودانی کے رحلت کی" (۲۸)۔

کریم الدین نے بھی اپنے تذکرے میں ناسخ کی وفات کے ضمن میں حرف بہ حرف اسی عبارت کو نقل کیا ہے۔ حالانکہ صہبائی نے یہ اطلاع ۱۸۴۲ء میں دی تھی اور وہ خود ۱۸۴۴ء میں اسی کو لکھ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے کریم الدین کو لکھنا چاہیے تھا کہ "اب چار پانچ برس ہوئے کہ اس جہان فانی سے طرف عالم جاودانی کے رحلت کی"۔ یعنی دو تین برس کے بجائے چار پانچ برس لکھنا چاہیے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ بعض مقامات پر انہوں نے اس قسم کی عبارتوں کو تبدیل کردیا ہے۔ مثلاً جرأت کی وفات کے سلسلے میں صہبائی کی تحریر ہے:

"قریب تیس برس کے گزرتے ہیں کہ اس جہان فانی سے انتقال کیا۔" (۲۹)

کریم الدین نے یہاں تیس برس کے بدلے بتیس برس کا اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح ذوق کے سلسلے میں صہبائی کی عبارت ہے:

"تیس برس کے عرصہ سے ملازم درگاہ حالت ولی عہدی سے شاہ حال دہلی کے ہیں۔ (ص ۳۲۲)

کریم الدین نے یہاں بھی بتیس برس کا اضافہ کیا ہے۔

ان مباحث کا حاصل کلام یہ ہے کہ کریم الدین نے صہبائی کے تذکرے "انتخاب دواوین" سے نقل کی حد تک استفادہ کیا ہے۔ جس پر سرقہ کا گمان ہوتا ہے۔ توارد کا نہیں۔

فارسی نگارشات

ہندستان کے چند ممتاز ترین فارسی شناسوں میں صہبائی کا شمار ہوتا ہے۔ یہ حضرات برصغیر ہندوپاک میں فارسی زبان و ادب کی دنیا میں اہم ستون ہیں۔ ہماری مراد امیر خسرو، فیضی، بیدل، ابوالفضل، غالب، صہبائی اور اقبال سے ہے۔ جو ہندی

النسل ہونے کے باوجود ہزاروں فارسی دانوں میں اپنی لطافت بیان، جدت ادا، ندرت مضامین اور کلام میں پختگی کے باعث ممتاز اور نمایاں ہیں۔

ہر عبقری اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے۔ صہبائی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نہ صرف ان کے زمانے کے سیاسی تقلبات احوال، معاشی زبوں حالی اور اخلاقی انتشار کا دخل تھا بلکہ ان کی عبقریت کی تشکیل میں ان کے فطری ذوق سخن سرائی اور خداداد ملکہ قادر الکلامی کے علاوہ اس عہد کی علمی و فکری تحریکوں، نیز والد کی تربیت اور استاد کی توجہ نے اہم رول ادا کیا ہے۔

صہبائی کی قدرت کلام و بیان کا اظہار زیادہ تر فارسی میں ہوا ہے۔ غالباً ظرف تنگنائے اردو ان کے بقدر شوق نہ تھا۔ بجز چند کتابوں کے، جن کا ذکر اوپر ہوا، ان کی ساری تصانیف فارسی میں ہیں۔ لیکن ان کی نثری نگارشات، شعری تخلیقات، تنقیدی محاکمات، تحقیقی فرمودات اور معلوماتی مکتوبات جس توجہ اور جس التفات کے مستحق تھے ان پر اتنی توجہ نہیں دی گئی۔

صہبائی نے فارسی تصنیف و تالیف کا کام کب سے شروع کیا؟ ان کی ابتدائی تحریریں کون سی ہیں؟ اس کے بارے میں کوئی ٹھوس اور پختہ معلومات فراہم نہیں ہیں۔ البتہ "بیاض شوق پیام" جس کی تاریخ نگارش اسی کے عنوان سے ۱۲۷۲ھ / ۵۶-۱۸۵۵ء نکالی گئی ہے۔ اس میں دو صفحات پر مشتمل "دیباچہ بیاض اشواق" کے نام سے ایک تحریر ملتی ہے۔ جس کی تاریخ تصنیف صہبائی نے اسی عنوان سے ۱۲۴۶ھ / ۳۱-۱۸۳۰ء نکالی ہے۔ یہ صہبائی کی ابتدائی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسی کتاب میں "دیباچہ بیاض اشواق" سے پہلے دو تحریریں "تعریف روضہ منورہ حضرت جلال تھانیسری" اور "بہارستان تخیل" کے نام سے ملتی ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس بیاض کی ابتدائی تحریریں زمانی ترتیب سے شامل کی گئی تھیں تو ان دونوں تحریروں کو ان کی ابتدائی تحریریں ماننا پڑے گا۔ کیونکہ اسی "دیباچہ بیاض اشواق" میں ایک

عبارت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی ۱۲۴۶ھ سے قبل ہی بیدلؔ اور ظہوریؔ کے طرز میں مرصع اور مسجع عبارتیں لکھنے لگے تھے (۳۰)۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ۴۵۔۱۲۴۴ھ سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کے بعد تادم حیات یہ سلسلہ جاری رہا۔ مندرجہ ذیل فارسی تصانیف ان کی یادگار ہیں:

۱۔ ریزہ جواہر مؤلفہ ۱۲۵۲ھ: صہبائیؔ کی تمام فارسی تصانیف میں اس کو خاص وقعت واہمیت حاصل ہے کیونکہ اس کی ترتیب میں انہوں نے ظہوریؔ کی سہ نثر کا تتبع کیا ہے۔ اور اسی کے اسلوب پر ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ وہ اس مرتبہ پر فائز نہ ہو سکے، جس پر ظہوریؔ کی حکمرانی ہے۔ تاہم اس کے انداز اور طرز ادا کو بہت حد تک کامیابی سے نبھایا ہے۔ چنانچہ جب یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر معرض وجود میں آئی تو ایک دھوم مچ گئی اور چہار دانگ عالم میں اس کی شہرت اور مقبولیت پھیل گئی اور بہت دنوں تک اہل علم و صاحب فن کے دل و دماغ پر اس کا نشہ چھایا رہا۔

یہ رسالہ دراصل بہادر شاہ ظفرؔ کی تعریف و توصیف میں ہے۔ جس طرح ظہوریؔ نے اپنے ممدوح ابراہیم عادل شاہ کو نو اوصاف سے متصف کیا تھا، اسی طرح صہبائی نے اپنے ممدوح کو سات اوصاف۔ معرفت، اتباع شریعت، سخنوری، عیش و عشرت، سخاوت، شجاعت اور عدالت سے مزین کیا ہے۔

۲۔ فرہنگ ریزہ جواہر: یہ کوئی مستقل رسالہ نہیں ہے۔ بلکہ "ریزہ جواہر" کے حاشیہ پر جن مشکل الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ اسی کا نام فرہنگ رکھا گیا ہے۔ یہ فرہنگ گرچہ مختصر ہے مگر "ہر کہ بقامت کہتر بقیمت بہتر" کے بمصداق اہم اور فائدہ مند ہے۔

۳۔ بیاض شوق پیام: اس بیاض میں مرتب کلیات صہبائی نے زیادہ تر ان کی متفرق تحریرات کے دیباچے اور خاتمے شامل کیے ہیں، جو اصل کتاب کے ساتھ بھی ہیں۔ چند چیزیں ایسی ہیں جو قابل اعتنا ہیں۔ یعنی اس میں صہبائی کے وہ

تقاریظ بھی ہیں جو انہوں نے حافظ، سر سید، آزردہ اور مولوی عبداللہ خاں علوی کی تالیفات پر لکھا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے مکتوبات بھی اسی میں شامل ہیں۔ ان مکتوبات میں قابل ذکر کوئی بات نہیں ہے۔ الفاظ کی رنگا رنگی تو ہے مگر مطالب کی کم مائیگی بھی ہے البتہ اپنے استاد علوی کو لکھے ایک رقعہ میں "مین پوری" کے واقعات کا ذکر ہے، جہاں صہبائی حوادث روزگار سے دوچار تھے۔

۴۔ **رسالہ در نحو فارسی مؤلفہ قبل ۱۸۴۹ء**: یہ رسالہ دراصل صہبائی نے مبتدی طالب علم اور عام فارسی داں کے لئے لکھا تھا۔ یہ ایک کارآمد رسالہ ہے، جس میں خشک اور پیچیدہ موضوع کو سلیس زبان میں بسہولت تمام سمجھایا گیا ہے۔

۵۔ **کافی در علم قوافی**: یہ رسالہ عروض و قوافی کے اصول و قواعد پر مبنی ہے، جو صہبائی کے تحقیقی کام کا عمدہ نمونہ ہے۔ انہوں نے اس میں تحقیق و جستجو کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ صہبائی کا عام دستور یہ ہے کہ وہ کوئی بات بغیر حوالہ سپرد قلم نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے قول کی تصدیق میں ماہرین فن کو بطور سند استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ اس تالیف میں بھی وہ روایت برقرار رکھی گئی ہے۔

۶۔ **وافی شرح کافی**: دو صفحات پر مشتمل یہ رسالہ "کافی" کی شرح ہے، جس میں صہبائی نے علم قوافی کے دقیق نکات اور باریک رموز کو واشگاف کیا ہے۔

۷۔ **رسالہ گنجینہ رموز مؤلفہ ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء**: فن معما میں صہبائی کا یہ شاہکار ہے۔ جس پر وہ بجا طور فخر کر سکتے ہیں۔ ملا کوہی نے جس شعر سے تین سے اوپر اسامی استخراج کیا تھا وہ شعر ہے

چون آن مہ روی خود از پردہ بنمود دل ازما برد و آخر کرد نابود

اس شعر سے اعمال معمائی کے طریقہ سے ۳۵۰ سے اوپر نام اس رسالہ میں مستخرج ہوئے ہیں۔ اور اسے بڑی شرح وبسط سے بیان کیا گیا ہے اور ہر عمل کی تفہیم میں ایک نیا نام اس مذکورہ شعر سے نکال کر مثال میں پیش کیا گیا ہے۔

۸۔ جواہر منظوم مؤلفہ ۱۲۵۱ھ: صہبائی کا یہ رسالہ اپنے فن (معما) میں گوہر نایاب ہے اور شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے معما کے طرز پر رباعی کہہ کر اللہ تبارک و تعالی کے ننانوے نام کا استخراج کیا ہے اور حاشیہ میں اس کے استخراج کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے۔

۹۔ رسالہ نادرہ مؤلفہ ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء: اس رسالہ کا موضوع بحث ملا کوجی کا یہ شعر ہے ؎

کشت امید حاصل ازان ماہ پر عتاب نیمی ز آب سر کش و نیمی نیافت آب

صہبائی نے اس رسالہ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ ۷ ۳ نام اعمال معمائی سے کیوں کر حاصل ہوتے ہیں۔ اس کا اہم حصہ، ابتدائی جزو ہے جس میں اعمال معمائی کی تشریح کی گئی ہے۔

۱۰۔ مخزن اسرار مؤلفہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء: فن معما میں یہ رسالہ صہبائی کی آخری تصنیف ہے۔ اس کو ''رسالہ نادرہ'' کا تکملہ یا توسیع سمجھنا چاہیے۔ ملا کوجی نے مندرجہ ذیل شعر سے ۷ ۳ نام کا استخراج کیا ہے۔

کشت امید حاصل ازان ماہ پر عتاب نیمی ز آب سر کش و نیمی نیافت آب

اس شعر سے صہبائی نے ۱۵۰ سے اوپر نام بر آمد کیے ہیں۔ اور اس کے استخراج کا عمل بھی نہایت سہل اور آسان ہے۔

۱۱۔ نتائج الافکار: یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جو بیاض کے طور پر مرتب کیا گیا ہے۔ صہبائی نے اس میں مدت العمر کے نتائج، تجربات اور تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ اس رسالہ کو دو فصلوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلی فصل صنعت معما سے تعلق رکھتی ہے جس میں صہبائی نے اپنے اور بعض دوسرے اساتذہ فن کے معموں کا حل پیش کیا ہے اور اکثر معموں کی بنیاد حساب جمل پر رکھی ہے۔ دوسری فصل میں ان امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندستان کے فارسی داں بے راہ روی کے شکار ہیں۔ پھر

انہوں نے اساتذہ کے مشہور مشکل اشعار کی وضاحت کی ہے۔ اساتذہ میں انوریؔ، خاقانیؔ، بدر چاچ، جلال اسیرؔ، نظامیؔ، حافظ، امیر خسروؔ، عرفیؔ، نظیریؔ اور زلالیؔ جیسے خدائے سخن کا کلام شامل ہے۔ اس کا یہ حصہ بہت دلچسپ اور کار آمد ہے کیونکہ اساتذہ کے کلام پر بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۲۔ **غوامض سخن**: اس رسالہ میں فارسی زبان کے لفظوں، محاوروں اور ترکیبوں کی الفبائی ترتیب سے تشریح کی گئی ہے اور سند میں اساتذہ کا کلام پیش کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک کار آمد اور مفید رسالہ ہے۔

۱۳۔ **تحقیق دوائر**: مرزا قادر بخش صابرؔ کے تذکرہ گلستان سخن کے مطالعے سے صہبائی کی اس تصنیف کا پتا چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ مکمل نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس کا نسخہ کہیں نہیں ملتا ہے یا یہ روزگار حوادث کی نذر ہو گیا۔

۱۴۔ **رسالہ اعلاء الحق** مولفہ ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء: "احقاق الحق" کے نام سے خان آرزوؔ نے ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں شیخ حزیںؔ کے گیارہ اشعار پر اعتراض کیا تھا۔ اسی کی تردید میں صہبائی نے "اعلاء الحق" کی تصنیف کی۔

یہ رسالہ صہبائی کے تنقیدی نقطہ نظر کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ انہوں نے خان آرزوؔ اور شیخ حزیںؔ کی تنقیدوں کا غیر جانب داری سے موازنہ کیا ہے اور جہاں کہیں شیخ حزیںؔ کی غلطی نظر آئی، اس کی انہوں نے صراحت کر دی ہے۔ اور جہاں خان آرزوؔ سے سہو ہوا ہے اس کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔

مذکورہ بالا ساری کتابیں کلیات صہبائی کی جلد اول میں شامل ہیں، جن کو منشی دین دیال نے ۱۲۹۵ھ میں مرتب کر مطبع نظامی کانپور سے شائع کیا تھا۔ اسی طرح اس کی دوسری جلد بھی انہوں نے ۱۲۹۶ھ / ۸۰۔۱۸۷۹ء میں چھپوایا تھا۔ اس کے دو حصہ ہیں۔ پہلے حصے میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۵۔ **شرح سہ نثر ظہوری**: چونکہ سہ نثر کی مرصع عبارت کے پیچ و خم

کو سمجھنے میں لوگ قاصر تھے۔ لہٰذا اس کے افادہ کو عام کرنے کے لئے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ جس کا سلسلہ صہبائی سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن صہبائی کی یہ شرح دیگر شروحات کے مقابلے میں کافی وقیع اور اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے شرح لکھتے وقت زبان و بیان کے تمام رموز و نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ خواہ علم بیان و بدیع ہو، یا تحقیقات لغات و محاورات، رموز قوافی ہوں یا نکات عروض، اصطلاحات نجوم ہوں یا موسیقی۔ غرض زبان و ادب کا کوئی گوشہ ان سے تشنہ نہ رہ سکا۔

۱۶۔ شرح مینا بازار مؤلفہ ارادت خاں واضح: "شرح سہ نثر ظہوری" کی تکمیل کے بعد صہبائی کی نظر التفات اس رسالے پر پڑی۔ چونکہ ان کو اپنے جگرپاروں کی پرورش و پرداخت کی فکر دامن گیر تھی۔ انہیں کی تربیت کی خاطر اس رسالے کی تشریح کی طرف متوجہ ہوئے۔ شارح نے الفاظ کی تحقیق، عبارات کی تشریح اور متعلقات کی توضیح کا حق ادا کیا ہے۔

۱۷۔ شرح پنج رقعہ مؤلفہ ارادت خاں واضح: صہبائی سے قبل اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی تھیں، جن میں عبدالرزاق سورتی کی شرح عمدہ ہے۔ لیکن صہبائی کو اس سے اطمینان نہ تھا اور طالب علموں کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے لخت جگر کی تربیت کے پیش نظر اور سرسید کی فرمائش پر اس کی شرح لکھنے پر آمادہ ہوئے۔ دوسری شرحوں کی طرح اس میں بھی وہی اصول و ضوابط اپنائے ہیں۔

۱۸۔ شرح شبنم شاداب مؤلفہ ظہیر تفرشی: یہ شرح صہبائی کی ابتدائی شرحوں میں ہے۔ ۲۵ صفحات کے رسالہ کی تشریح میں انہوں نے ۲۰۷ صفحات سیاہ کیے ہیں۔ چونکہ صہبائی قواعد زبان، علم لغت، علم بیان اور عروض و قوافی پر خصوصی عبور رکھتے تھے اور لغوی، اصطلاحی، املائی، تلمیحی اور دوسرے فنی امور و مسائل پر انہیں مہارت تامہ تھی۔ اس لئے نازک سے نازک مسائل ان کی گرفت میں آسانی سے آجاتے ہیں۔ اور وہ ایک غواص کی طرح اس کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

کلیات جلد دوم کا دوسرا حصہ مندرجہ ذیل کتابوں پر مشتمل ہے:

۱۹۔ شرح حسن و عشق مؤلفہ نعمت خاں عالی: اس شرح میں صہبائی نے تدقیق معانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ چونکہ فارسی کے قدیم متون اور مستند مآخذ اور اساتذہ کے دواوین پر ان کی نظر گہری تھی۔ اس لئے ہر جگہ انہوں نے اپنی اس قابلیت کا استعمال کر شرح کو ایک مستند مأخذ کا حامل بنا دیا ہے۔

۲۰۔ شرح معمای نصیر ہمدانی: صہبائی کی یہ شرح، شرح معمای ہمدانی، شرح نصیرای ہمدانی اور حل مقامات انشاے نصیر ہمدانی کے مختلف ناموں سے جانی جاتی ہے۔ اس میں صرف معما کی تشریح کی گئی ہے۔ موجودہ دور میں ایسے لوگ ملتے ہی نہیں ہیں جو اس فن پر مہارت رکھتے ہوں۔ کیونکہ اب وہ دور نہیں رہا جس میں پیچیدگی کو ہنر پر اور تصنع کو کمال پر ترجیح دی جاتی تھی۔

۲۱۔ شرح معمائے جامی: شرح کی ابتدا میں صہبائی نے معما کی تعریف اور اس سلسلے میں جامی اور دوسرے اساتذہ کے اقوال نقل کیے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کی تشریح بڑی تحقیق اور مہارت سے کی ہے۔ اور اس کے معانی و مطالب کو دلکش و رنگین عبارتوں کے ذریعہ واشگاف کیا ہے۔ صہبائی نے دیکھا کہ اب یہ فن ختم ہوتا جا رہا ہے تو وہ اس کو زندہ کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔ چنانچہ معما کہنے کے علاوہ معمائی کتابوں کی شرح کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا۔ انہیں میں ایک جامی کا رسالہ "معمائے جامی" ہے۔

۲۲۔ رسالہ مناقشات سخن: امام بخش صہبائی کے زمانے میں مولوی امام علی مقتول نے مکتوب کی شکل میں اپنی انشاپردازی کا نمونہ پیش کیا، جس پر ان کو بہت ناز تھا۔ صہبائی نے ان کے خلاف قلم اٹھایا اور ان کی انشاپردازی کا موازنہ کر ایک محاکمہ کتابی صورت میں پیش کیا۔ اور ان کی لفظی، نحوی اور معنوی غلطیوں کی نشاندہی کی۔

۲۲۔ قول فیصل: صہبائی کا یہ رسالہ فن تنقید پر اپنے زمانے کا بہترین اور

معیاری رسالہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی شہرت بھی کافی ہوئی اور صہبائی کا مترادف خیال کیا جانے لگا۔ یہ رسالہ دراصل "اعلاء الحق" کی طرح خان آرزو اور شیخ حزیں کے محاکمہ کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس ادبی محاکمہ میں صہبائی نے جانبداری سے کام نہیں لیا ہے بلکہ بلا لحاظ دونوں نابغہ روزگار کا موازنہ پیش کیا ہے اور حق کی نشاندہی کی ہے۔

۲۴۔ دیوان صہبائی: صہبائی کا دیوان، کلیات کی پہلی جلد میں شامل ہے۔ جس میں ردیف وار ۱۶۱ غزلیں، ۶ قصائد، ۴ فردیات، ۱۲ رباعیات اور ایک مخمس شوکت بخاری کی غزل پر شامل ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شعری شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں طرز بیدلؔ کا کافی عمل دخل ہے۔ گرچہ ان کے اشعار میں طرز بیدلؔ کے اثرات واضح اور صریح طور پر پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی انفرادیت بھی برقرار نظر آتی ہے۔

۲۵۔ رسالہ حل مقامات جواہر الحروف مؤلفہ ٹیک چند بہار: اس رسالہ کا ذکر "شرح سہ نثر ظہوری" میں ایک سے زاید مقامات پر آیا ہے۔ لیکن اب ناپید ہے۔ البتہ "کلیات صہبائی" کی پہلی جلد میں اس کا دیباچہ ملتا ہے۔ صہبائی نے اس میں لکھا ہے کہ انہوں نے جواہر الحروف کے جس نسخہ سے استفادہ کیا تھا۔ وہ مصنف کا خودنوشت تھا۔

۲۶۔ شرح مختصر رسالہ جواہر الحروف: "رسالہ حل مقامات جواہر الحروف" کو علمی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔ اس کو دیکھتے ہوئے صہبائی کے دوست احباب نے رسالہ جواہر الحروف کی مختصر سی شرح لکھنے کی فرمائش کی۔ اور وہ ان کی فرمائش کو ٹال نہ سکے اور اس کام میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اب یہ رسالہ ناپید ہے۔ صرف اس کا دیباچہ کلیات صہبائی کی جلد اول میں ملتاہے۔

۲۷۔ شرح الفاظ مشکلہ ٹیک چند بہار: مولوی کریم الدین کے بیان

کے مطابق شرح الفاظ مشکلہ ٹیک چند بہآر کے نام سے صہبائی کی ایک اور کتاب ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ محققین کے نزدیک یہ طے نہیں ہو پایا ہے کہ یہ الگ رسالہ ہے یا "شرح جواہر الحروف" کا ہی دوسرا نام ہے۔

۲۸۔ رسالہ حل مقامات عبدالواسع ہانسوی: یہ کوئی باضابطہ تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ صہبائی کے شاگردوں نے دوران تعلیم جو فوائد و اشارات ان سے معلوم کر کے قلمبند کیے تھے، منشی دین دیال نے ان کو یکجا کر کلیات صہبائی میں شامل کر دیا ہے۔ رسالہ گرچہ مختصر ہے مگر مطالب و مفاہیم کے اعتبار سے بہت قیمتی ہے اور استفادہ کے لائق ہے۔

۲۹۔ رسالہ حرف فارسی: فہرست مخطوطات فارسی رضالائبریری رامپور صفحہ ۳۴۵ میں صہبائی کی ایک اور تصنیف بعنوان "رسالہ حرف فارسی" ملتی ہے۔ یہ رسالہ ۱۹اوراق پر مشتمل ہے، جس کی کتابت غلام حسین خاں رامپوری نے کی ہے۔

حواشی:

۱۔ خطبات گارساں دتاسی ص ۱۶۴
۲۔ انتخاب دواوین (مقدمہ) ص ۱۴
۳۔ مقالات شبلی ۲/ ۸۵
۴۔ حیات جاوید ص ۶۵۳
۵۔ اردو ادب کی تاریخ مع حواشی و تعلیقات ص ۱۶۴
۶۔ مسالک و منازل ص ۳۴۱ (فٹ نوٹ)
۷۔ قطعہ منتخب ص ۴۲
۸۔ سخن شعرا ص ۲۷۲
۹۔ خم خانہ، جلد اول، دیباچہ

۱۰۔ گلستان سخن (مقدمہ) ۱/ ۱۷

۱۱۔ جہان غالب، معاصر پٹنہ نمبر ۴، دسمبر ۱۹۵۳ء ص ۷

۱۲۔ دستور الفصاحت ص ۱۰۳ (مقدمہ)

۱۳۔ دلی کالج اردو میگزین (قدیم دلی کالج نمبر) ۱۹۵۳ء

۱۴۔ اردوئے معلیٰ جلد دوم، ص ۵۷۲، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۵۔ ایضاً جلد اول ص ۱۰۷

۱۶۔ ایضاً ۲/ ۵۷

۱۷۔ ایضاً ۲/ ۴۱

۱۸۔ گلستان سخن ۱/ ۲۷

۱۹۔ ایضاً ۲/ ۵۱۳

۲۰۔ اردو شعرا کے تذکرے ص ۴۱۱

۲۱۔ گلستان سخن (مقدمہ) ص ۷۵

۲۲۔ ایضاً ص ۱۰۱

۲۳۔ اردو مثنوی ص ۴۰۷

۲۴۔ اردو شعرا کے تذکرے ص ۳۲۳

۲۵۔ معاصر پٹنہ، نمبر ۶ جولائی ۱۹۶۷ء

۲۶۔ اردو شعرا کے تذکرے ص ۳۲۳

۲۷۔ گلدستہ نازنیناں (مقدمہ) ص ۱۴

۲۸۔ انتخاب دواوین

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ کلیات صہبائی ص ۶۸

صہبائی بحیثیت عروض داں / ترجمہ نگار

اب تک کی تحقیق کے مطابق "ترجمہ حدایق البلاغت" صہبائی کی اولین اردو تصنیف ہے، جو ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۴ء میں طبع ہوئی۔ حالانکہ انہوں نے ۴۵۔۱۲۴۴ھ سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن وہ سب فارسی زبان کی کتابیں تھیں۔ البتہ اردو میں صہبائی کی معلوم تصنیف یہی ترجمہ ہے۔

حدایق البلاغت فارسی زبان میں ہے جس کے مصنف میر شمس الدین فقیر دہلوی ہیں۔ میر شمس الدین فقیؔر اپنے وقت کے ممتاز عالم تھے اور فن عروض و قوافی میں تو اس وقت ان کا کوئی نظیر نہ تھا۔ شیفتؔہ ان کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فقیؔر تخلص میر شمس الدین دہلوی از بنی عباس است، در دری زبان دستگاہی دارد ولا سیما در عروض و قافیہ بے نظیر وقت خویش است۔ رسالہ جات تصنیف کردہ وی بدین مدعا گواہ۔ در ۱۱۷۰ھ بعد کسب سعادت زیارات حرمین شریفین زادھما اللہ شرفاً و تعظیماً ہنگام بازگشت زورق حیاتش طوفانی شد گاہی ریختہ ہم گفتے (۱)۔"

میر شمس الدین فقیؔر نے ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۵ء میں "حدایق البلاغت" کے عنوان سے ایک کتاب عروض و قافیہ کے فن پر لکھا اور اس کو پانچ حدیقے بیان، بدیع، عروض، قوافی، معما اور ایک خاتمہ "دزدھای شعری" میں منقسم کیا۔ یہ کتاب اپنے وقت کی نہایت اہم، قابل قدر اور معتبر تصور کی جاتی ہے اور یہ اپنے زمانے کی درسیات میں شامل تھی۔

امام بخش صہبائی جب دہلی کالج سے منسلک ہوئے تو پرنسپل بوترو نے اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر صہبائی سے اس کو اردو میں منتقل کرنے کی فرمائش کی۔ اس ترجمہ کے اسباب اور سال تصنیف پر روشنی ڈالتے ہوئے صہبائی دیباچہ میں تحریر

فرماتے ہیں:

"حدایق البلاغت علم بیان اور بدیع اور عروض میں شمس الدین فقیر رحمتہ اللہ علیہ کے قلم بلاغت رقم کا ثمرہ ہے اور اس کتاب کا اس فن کے استیعاب میں شہرہ ہے صاحب والا بلند مراتب حاکم داد اور دہش گستر بوترس صاحب بہادر دام اقبالہ نے کہ شہر سعادت بہر شاہجہاں آباد کے مدارس کے پرنسپل ہیں، فقیر سراپا تقصیر، خاک پاے علماء، گدائے سر کوچہ فضلا، سرگشتہ وادی ناتوانی امام بخش صہبائی کو کہ طلبہ فارسی خواں کی تعلیم کے لئے مدرسی اول کے عہدے پر مشرف ہے، ارشاد کیا کہ اگر یہ نسخہ فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جاوے اور اس میں عربی اور فارسی مثالوں کی جگہ اردو زباندانان ہند کے مندرج ہوں تو ان لوگوں کے واسطے کہ اردو اشعار سے ذوق رکھتے ہیں اور اس قدر استعداد نہیں رکھتے کہ فارسی کتابوں سے ان مطالب عالیہ کو سمجھ لیں، بہت مفید ہوگا۔ اس واسطے اس خاکسار نے بموجب اس کے کہ المامور معذور باوجود کمی استداد کے تقدیم امر میں سعی کر کے اس رسالہ کو ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں مرتب کیا۔" (ص ۲۔۳)

"ترجمہ حدایق البلاغت" بھی اصل کتاب کی طرح پانچ حدیقوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ صہبائی خود رقم فرماتے ہیں:

"اس کتاب میں پانچ حدیقے اور ایک خاتمہ ہے۔ حدیقہ پہلا علم بیان میں، حدیقہ دوسرا علم بدیع میں، حدیقہ تیسرا علم عروض میں، حدیقہ چوتھا قافیہ میں، حدیقہ پانچواں فن معما میں اور خاتمہ سرقات شعریہ میں۔" (ص ۳)

پھر ہر حدیقہ کو ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر ایک حدیقہ کے لئے ذیلی عنوانات کو الگ الگ نام دیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے اس کی وضاحت کی جارہی ہے:۔

حدیقہ چہارم کے ذیلی عنوانات:

عروض و قوافی کے فن پر اردو میں یہ پہلی کاوش ہے۔ اس سے قبل اس فن پر کوئی کتاب اردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔ چنانچہ محمد یحیٰ تنہا لکھتے ہیں:

"یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند کتاب خیال کی جاتی ہے۔"(۲)

اور مولانا حامد حسن لکھتے ہیں:

"یہ اردو میں اس فن کی پہلی مکمل و مستند کتاب ہے۔"(۳)

اس کے ساتھ اسے تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے کہ یہ پرنسپل بوترو کی فرمائش پر ترجمہ کیا گیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۳ء میں شائع ہوا اور یہ ترجمہ اتنا مقبول ہوا کہ پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اور دوسرے ایڈیشن کی نوبت جلد ہی آ گئی۔ مولوی کریم الدین اس دوسرے ایڈیشن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بموجب حکم سکریٹری سوسائٹی کے کتاب حدایق البلاغت کا ترجمہ جو اصل میں شمس الدین فقیر کی تصنیف ہے، زبان اردو میں اس شخص (صہبائی) نے بہت اچھا کیا ہے۔ جو حق ترجمہ کا ہوتا ہے وہ ادا کیا ہے۔ یہ

ترجمہ درمیان ۱۸۴۳ کے سید عبدالغفور کے اہتمام سے سید الاخبار دہلی درمیان کوچہ چیلان کے چھپا۔ بعدازاں ۱۸۴۴ء میں میرے اہتمام سے بھی رفاہ عام واقع حوض قاضی میں چھپا۔" (۴)

صہبائی نے اس میں لفظ بلفظ ترجمہ کے اصول کی بالکل رعایت نہیں کی ہے بلکہ اس کو عام فہم اور زود اثر بنانے کے لئے مطلب کی وضاحت پر انہوں نے خاص دھیان دیا ہے۔ ساتھ ہی فقیر کی غلطیوں اور ان کے تسامحات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح یہ ترجمہ اصل کتاب سے بہت حد تک مختلف ہو گیا ہے۔ چنانچہ بعض مباحث ایسے بھی نظر آتے ہیں جو اصل کتاب سے زیادہ ہیں۔ دیباچہ میں خود صہبائی نے اس کی صراحت کی ہے:

"مستعدان انصاف پسند پر مطالعہ کے وقت ظاہر ہو گا کہ اس کم استعداد نے مسائل علمی کے لکھنے اور امثلہ اردو کے فراہم کرنے میں کس قدر سعی کی ہے اور جو کہ یہ مقصود تھا کہ علم بیان اور بدیع اور عروض سے طالبین کو فائدہ تام حاصل ہو۔ اس واسطے بہت مسائل اصل کتاب سے زیادہ کر دیے اور از بسکہ لفظ لفظ کے ترجمہ میں مطلب کی توضیح خوب نہیں ہوتی اس لئے ترجمہ میں اس امر کا مقید نہیں ہوا۔" (ص ۳)

صہبائی کا یہ قول تعلی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ یہ ان کی حقیقت بیانی ہے، جس کا شاہد یہ ترجمہ ہے اور نقادان فن کی اس پر بے لاگ رائیں اور تنقیدیں ہیں۔ چنانچہ اس ترجمہ پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

"صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے" (۵)

گارساں دتاسی اس ترجمہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"فارسی کتاب حدایق البلاغت کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کیا ہے۔ یوں کہنا

چاہئے کہ انہوں نے اس کتاب کے مطالب کو اردو شاعری میں ڈھال لیا ہے"(٦)

اور محمد یحیی تنہاؔ بھی اس خیال سے متفق نظر آتے ہیں:

"صہبائی مرحوم کی زبان صاف اور رواں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ پروفیسر ہونے کی وجہ سے انہوں نے ایسی عبارت لکھی تاکہ طلاب کو دقت نہ ہو۔ ورنہ آپ کے ہم عصر خصوصاً وہ لوگ جو علم و فضل میں یگانہ روزگار تھے۔ تعقید کے بغیر اپنی عبارت نہیں لکھ سکتے۔ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر اس کو پیچیدہ بنادیتے ہیں۔ آپ کی اصل عبارت اور ترجمہ یکساں معلوم ہوتا ہے۔ اور دونوں عبارتیں نہایت صاف اور سلیس ہیں۔ چونکہ یہ ترجمہ پرنسپل صاحب کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ اس لئے اس کو شگفتہ عبارت میں لکھنا بھی لازم تھا۔ بہر حال یہ بھی صہبائی مرحوم کی قادرالکلامی ہے کہ وہ ایسی عبارت لکھ سکتے تھے۔ سرسید کی آثار الصنادید میں آپ نے قافیہ پیمائی فرمائی تھی اور اس زمانے کے لحاظ سے رواج کی پابندی کی تھی۔ لیکن سرسید کو یہ طرز تحریر پسند خاطر نہ ہوا اور آثار الصنادید کی عبارت صاف اور سادہ زبان میں خود تحریر کی"(٧)

لیکن مولانا محمد ادریس کا خیال اس کے برعکس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولوی امام بخش دہلوی صہبائی نے حدایق البلاغت مصنفہ مولوی شمس الدین صاحب فقیرؔ رحمتہ اللہ علیہ کا ترجمہ اس وقت کیا تھا جب کہ اردو زبان کا ہیولی اپنی ترکیب کی ابتدائی منازل سے گزر رہا تھا اور ابھی اس نے کوئی موزوں صورت نوعیہ اختیار نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں نہ صرف یہ کہ ترجمہ تحت اللفظ ہوتا تھا بلکہ عام اردو تحریر بھی فارسی کا ترجمہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ اس ترجمہ حدایق البلاغت کی زبان بھی اس قدر

ناما نوس، پیچیدہ اور اجنبی ہے کہ اصل فارسی سمجھ لینا آسان ہے مگر اس اردو کا سمجھنا مشکل۔ پھر فن کتابت بھی اس وقت ناآشنائے رسم وراہ تھا۔ "بسم اللہ" سے شروع ہو کر "تمام شد" پر کتاب ختم ہو جاتی ہے مگر کہیں پیراگراف، ڈیش، کوما، نمبر وغیرہ کا نام نہیں۔ کتاب کا یہ تسلسل بھی کچھ کم بھیانک نہیں ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ علم بیان، علم بدیع، علم عروض اور علم القوافی پر اردو زبان میں بہترین جامع کتاب ہے" (۸)

اس تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے صہبائی کے ترجمہ کو ٹھیک سے پڑھا اور نہ اس کو ٹھیک سے سمجھا ہے۔ ورنہ وہ ایسی بات ہرگز نہیں لکھتے۔ چونکہ ان کو اپنا نام مصنفین کی فہرست میں شامل کرانا تھا۔ اس لئے ان کو کچھ نہ کچھ تو جواز پیش کرنا ہی تھا۔ اس لئے بلا سوچے سمجھے لکھ دیا کہ صہبائی کا ترجمہ ناما نوس، پیچیدہ اور اجنبی ہے۔ حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ ایک دو نمونوں سے اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

صہبائی	مولانا محمد ادریس
علم بیان چند قاعدوں کا نام ہے کہ ان کو اگر ایسی طرح سے یاد کریں کہ وہ سب ذہن میں حاضر رہیں تو ایک معنی کو کئی طریق سے ادا کر سکتے ہیں اور وہ طریق مختلف ہوتے ہیں۔ بعض ان میں سے اس معنی پر اس طرح سے دلالت کرتا ہے کہ اس سے وہ معنی صاف سمجھے جاتے ہیں اور بعض سے وہ معنی صاف صاف اور واضح نہیں سمجھے جاتے بلکہ بعد فکر اور تامل کے	علم بیان ایسے قواعد کے مجموعہ کا نام ہے جن کو جان لینے اور ذہن نشیں کر لینے کے بعد ایک معنی (مقصد) کو ایسے چند طریقوں سے ادا کر سکیں، جن میں بعض اس مقصد کو ادا کرنے میں واضح ہوں اور بعض محتاج غور و تامل۔ (ص ۳) علم بدیع ایسے امور کا علم جو فصیح و بلیغ کلام کے لئے زینت و تحسین کا

سمجھ میں آتے ہیں۔ (ص ۳)
علم بدیع ایک علم ہے کہ اس سے چند امور ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ وہ کلام کی خوبی کے باعث ہیں اور ان امور سے خوبی کلام کی جب ہے کہ پہلے علم معانی اور علم بیان کے قواعد سے مزین ہو چکا ہو کس واسطے کہ اگر کلام ایسا نہ ہوگا تو ان امور کا کلام میں استعمال کرنا ایسا ہے کہ جیسے ایک بدصورت کو زیور پہنا دیں (ص ۶۴)

موجب ہوتے ہیں جس طرح خوب صورت و خوب سیرت دلہن کے لئے زیورات، اچھا لباس۔ اگر کلام فصاحت وبلاغت سے خالی ہو اور ان امور سے آراستہ ہو تو ایسا ہی ہے جیسے بدصورت و بدسیرت دلہن پر زیور اور لباس۔ (ص ۷۲)

ان دونوں مثالوں سے دونوں ترجموں کے مابین فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان میں ایک اس زمانے کی اردو ہے جب اردو عہد طفلی سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اور دوسرا ترجمہ اس زمانے کا ہے، جب اردو ترقی یافتہ ہے۔ پھر بھی صہبائی کی زبان زیادہ سلیس اور معنی خیز ہے۔

صہبائی نے صرف ترجمہ پر اپنی توجہ مرکوز نہیں رکھی بلکہ علم و عقل کی نگاہیں بھی کھلی رکھی ہیں۔ چنانچہ ترجمہ کرتے وقت ان کو جہاں جہاں مصنف کی بات قابل گرفت معلوم ہوئی، انہوں نے اس کی وضاحت کر دی ہے اور اس کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے۔ ''صنعت موازنہ'' کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معلوم کیا چاہیے کہ جن لوگوں نے یہ توہم کیا ہے کہ موازنہ میں مماثلت مختص شعر کے ساتھ ہے۔ یہ غلط ہے اور جن لوگوں نے یہ توہم کیا ہے کہ وہ مختص نثر کے ساتھ ہے۔ یہ بھی محض بیجا ہے کس واسطے کہ وہ نثر اور نظم دونوں میں جاری ہوتی ہے جیسے نثر اور نظم کی مثال سے واضح ہو گیا۔ اور توہم نثر سے خصوصیت رکھنے کا اس سبب سے ہے کہ عربی کی

کتابوں میں اس صنعت کی تعریف میں لکھا ہے کہ وہ مساوی ہونا دو فاصلوں کا ہے وزن میں اور فاصلہ نثر کے الفاظ اخیرہ ہی کو کہتے ہیں اور یہ نہ جانا کہ ذکر فاصلہ کا بطریق احتراز کے نہیں ہے تاکہ اس سے نظم خارج ہو جاوے بلکہ بطریق مثال کے ایک کا ذکر کر دیا ہے اور بنا بر اختصار کے مصرع کا ذکر چھوڑ دیا ہے اور چونکہ یہ صنعت نظم میں بھی جاری ہوتی ہے شرح کرنے والوں نے فاصلہ کے آگے لفظ مصرع کا بھی لاحق کر دیا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ حدایق البلاغت کے مصنف نے جو یہ کہا ہے کہ یہ صنعت نظم میں نہیں آتی کیونکہ نظم کے آخر میں قافیہ واجب ہے از روے سہو کے ہے اور یہ نہ خیال کیا کہ آخر میں نظم کے قافیہ کا ہونا اس صنعت کے نظم میں جاری ہونے کے منافی نہیں جیسے اس شعر سے کہ اس صنعت کی مثال میں مذکور ہوا، واضح ہے۔" (ص ۱۰۰)

صہبائی نے قابل گرفت باتوں کی وضاحت میں محض اختلاف برائے اختلاف کے اصول کی پابندی نہیں کی ہے بلکہ غلطی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے ان کی باتوں میں وزن پیدا ہو گیا ہے۔ مذکورہ بالا مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انہوں نے غلطی کی نشاندہی کے لئے کون سا اصول اپنایا ہے۔

چونکہ صہبائی کو پرنسپل بوترو کی جانب سے حکم تھا کہ عربی فارسی مثالوں کی جگہ اشعار اردو مندرج ہوں۔ اس لئے انہوں نے ان مباحث کو جو اردو میں مستعمل نہیں ہوتے، اس کو ترک کر دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اب سننا چاہئے کہ وصل اس حرف کو کہتے ہیں کہ روی کے ساتھ متصل ہووے اور مزید وہ کہ وصل سے متصل ہوئے اور خروج وہ کہ مزید سے متصل ہووے۔ نائرہ وہ کہ جو خروج سے متصل ہووے اور ان حرفوں میں سے بجز وصل کے اشعار اردو میں واقع نہیں ہوتا اور وہ بھی اغلب انہیں

الفاظ میں ہوتا ہے کہ فارسی ہیں مثلاً ''خفتہ'' اور نہفتہ'' کہ تے حرف روی کا ہے اور ہائے ہوز حرف وصل کا کہ زائد ہے اور تین حروف باقی اشعار فارسی میں اکثر الوقوع ہیں۔ اس کی مثالیں بھی فارسی میں تلاش کرنی چاہیئے اور چونکہ اشعار اردو میں نہیں آتے ان کی مثال اردو کے اشعار میں نہیں ہے۔ اس واسطے ان کا بیان ترک کر کے شعبہ دوسرے کو لکھتا ہوں۔'' (ص ۱۴۹)

اور بعض مباحث ایسے ہیں جو نہ تو فارسی میں آتے ہیں اور نہ اردو میں۔ اس کو صہبائی نے ترک کر دیا ہے۔ ''قافیہ متکاوس'' کی بحث میں لکھتے ہیں:

''اور قافیہ متکاوس اشعار فارسی میں بھی نہیں آتا چہ جائے اشعار اردو کے، اس واسطے اس کی مثال مرقوم نہیں ہوئی۔،، (ص ۱۵۵)

اس کے ساتھ صہبائی نے ترجمہ میں حسب موقعہ اضافے بھی کیے ہیں۔ نیز جہاں مثال میں اردو شعر نہیں مل سکا ہے، خود کہہ کر اس کی تکمیل کر دی ہے۔ مثلاً:

''حدائق البلاغت کے مصنف نے اگرچہ بحر قریب اور جدید اور مشاکل کو مذکور نہیں کیا۔ لیکن مترجم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طالبین کے فائدہ کے واسطے ان کو بھی یہاں لکھے۔'' (ص ۱۴۰)

مترجم نے اپنے ترجمہ کو مفید، کار آمد اور عام فہم بنانے کی خاطر بعض مباحث میں تفصیل سے کام لیا ہے۔ پرنسپل بوترو کی فرمائش تھی کہ فارسی عربی مثالوں کو ترک کر اردو مثالیں درج کی جائیں۔ لیکن مترجم کو اس کا خوب اندازہ تھا کہ صرف اردو اشعار نقل کر دینے سے بات نہیں بنے گی۔ اس لئے انہوں نے مثالیں لکھنے کے بعد اس میں پنہاں رموز و نکات کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ حکیم مومن خاں مومنؔ کے ایک شعر پر انہوں نے جو تفصیل پیش کی ہے، وہ قابل دید ہے۔ اس سے صہبائی کی دیدہ وری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ نیز ان کی علمی گرفت، ادبی پرکھ، تنقیدی سوجھ بوجھ، فنی لیاقت اور فکری صلاحیت واستعداد کا بھی پتا چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو صہبائی کی گل کاریاں:

"اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

معشوق کے نقش پا کو سجدہ کرنا اس کی تعظیم ہے اور ظاہر اور متعارف یہ ہے کہ کسی معتقد فیہ کی تعظیم سے ذلیل نہ ہو۔ پس تعظیم سے ذلیل ہونا ایک وصف ہے کہ فی نفسہ ثابت نہیں لیکن محال بھی نہیں بلکہ ممکن ہے کہ وہ امر کسی کے حق میں موجب ذلت کا ہو جاوے اور از بسکہ یہ امر غیر ثابت تھا۔ اسی واسطے مصرعہ ثانی میں اس کی علت بیان کی یعنی معشوق کوچہ رقیب میں تھا اور جب عاشق نے اس جگہ نقش پاے معشوق کو سجدہ کیا تو رقیب کے کوچہ میں سر کے بل جانا واقع ہوا اور ایسے مقام میں اس طرح کے امر کا ظہور میں آنا موجب ننگ کا ہے۔ (ص ۸۳)

اتنا ہی نہیں بلکہ اشعار کی توضیح و تشریح کرتے وقت کلام کی خوبی و اچھائی اور اس کے عیوب و نقائص کی جانب بھی اشارہ کر دیا ہے۔ حسن تعلیل کی مثال سودا کے کلام سے دی گئی ہے۔ اس شعر کی توضیح کرتے ہوئے صہبائی لکھتے ہیں:

" اتنا حسد ہے عاشق و معشوق میں کہ نور
منہہ پر جو ہووے شمع کے تو جل مرے پتنگ

جل مرنا پتنگ کا ایک وصف ثابت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ بسبب شعلہ شمع کے ہے۔ لیکن شاعر نے اس کی علت حسد کو ٹھہرایا ہے۔ یہ مضمون بہت خوب بندھا تھا لیکن چونکہ مصنف نے ایک اور قصیدہ کے مطلع میں باندھ لیا، وہ مضمون مبتذل ہو گیا اور وہ یہ ہے ؎

اشجار کا بستان جہاں میں ہے عجب ڈھنگ
جلتا ہے چنار اس سے رخ گل پہ ہے جو رنگ

اور اس جاے میں بھی چنار کا جلنا ظاہر ہے کہ بسبب اس بات کے ہے

کہ چنار کا مزاج گرم ہوتا ہے اور شاعر نے علت اس کی حسد اور بغض کو قرار دے لیا۔" (ص ۸۲)

جس اصطلاح اور صنعت وغیرہ کی مثالیں صہبائی نے پیش کی ہیں۔ اس کو اچھی طرح وضاحت کر کے سمجھایا بھی ہے تاکہ وہ بحث گنجلک اور نافہم نہ ہو جائے۔ "صنعت طباق" میں درد کے ایک شعر کو مثال بنانے کے بعد اس کی اس طرح وضاحت کی ہے:

"ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

مرنے کے مقابلے میں لفظ مسیحائی کا واقع ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ مرنے اور مسیحائی میں کچھ تضاد نہیں بلکہ مرنے اور جینے میں تضاد ہے اور جلانے کے ساتھ مسیحا کو علاقہ ہے یعنی جلانا حضرت مسیح کا معجزہ ہے۔" (ص ۱۶۸)

اسی طرح "صنعت تلمیح" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ اس طرح ہے کہ کلام مشعر ہو کسی واقعہ مشہورہ پر یا ایسی چیز کا اشارہ کیا جاوے کہ کتب مستعملہ میں مذکور ہو جیسے شعر سودا کا

دکھلایئے جا کر تو تجھے مصر کا بازار
پرواں کوئی خوباں نہیں اس جنس گراں کا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف قصہ حضرت یوسف کے کہ وہ مشہور ہے اور یہ شعر فقیر محمد خاں گویا کا

منہ دکھانا تو کہاں باتیں تھیں اس کی مجھ تک
لن ترانی کی بھی آتی نہ صدا میرے بعد

اس شعر میں حضرت موسیٰ کے قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ حق یہ ہے کہ جو لوگ کہ چاشنی انصاف اور مذاق شعر سے بہرہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک یہ شعر جواب نہیں رکھتا۔" (ص ۱۰۲)

اسی طرح "سرقہ" کے بیان میں دو شعروں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شعر اول مومن کا

خوں بہا قاتل بے رحم سے مانگا کس نے
کہ فرشتے مجھے یاں داغ درم دیتے ہیں

دوسرا شعر شیخ ابراہیم ذوق کا

کہتی تھی ماہی بریاں کہ دبیران قضا
داغ دیتے ہیں اسے جس کو درم دیتے ہیں

ظاہر ہے کہ اول شعر میں داغ درم دینا اور خوں بہا مانگنا محض ادعا ہے
اور دوسرے شعر میں داغ دینا اور صاحب درم ہونا ثابت ہے۔ اول شعر
سے داغ اور درم کا مضمون اخذ کر کے ایسی طرح سے ادا کیا کہ اس کی نسبت
بہت بلیغ ہو گیا۔" (ص ۱۵۹)

میر شمس الدین فقیر نے حدایق البلاغت کا پانچواں حدیقہ فن معما کے لئے وقف کیا تھا۔ لیکن اس کا ترجمہ کرتے وقت پرنسپل موصوف نے صہبائی سے اس کو چھوڑ دینے کو کہا۔ چونکہ معما کا فن بہت ہی مشکل اور دماغ سوزی کا باعث ہوتا ہے۔ بڑے بڑے اساتذہ فن بھی اس خارزار وادی میں قدم رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ غالب جیسا شخص بھی اس سے کوسوں دور بھاگتا تھا، چنانچہ صفیر بلگرامی کے ایک بار دریافت کرنے پر کہ "پٹنہ کے لوگ آپ کے معما اور چیستاں کے مشتاق ہیں"۔ مرزا نے انہیں جواب دیا:

"یارب وہ کون بزرگ ہیں کہ سودائی کو معمائی سمجھتے ہیں۔ اصل فطرت
میں میرا ذہن تاریخ و معما کے ملایم نہیں پڑا ہے۔ جوانی میں از راہ شوخی طبع
گشتی کے تین عامیانہ معمے لکھے۔ وہ مبادی کلیات فارسی میں موجود ہیں۔" (۹)

نیز اس زمانے میں معما کا فن کساد بازاری کا شکار تھا اور لوگوں کا رجحان اس جانب سے ہٹنے لگا تھا۔ اس لئے پرنسپل موصوف نے صہبائی سے اسے ترک کر دینے کو کہا۔ حالانکہ صہبائی کو اس فن میں بڑی اچھی دست قدرت تھی، جس کا ثبوت وہ اپنی

فارسی تصانیف کے ذریعہ دے چکے تھے۔ اس لئے ان کی اندرونی خواہش تھی کہ اس حصہ کا بھی ترجمہ کر دیا جائے۔ لیکن وہ اس معاملے میں مجبور تھے۔ اگر واقعی ان کو اس کا ترجمہ کرنے کی اجازت ملتی تو وہ خاصے کی چیز ہوتی۔ ہو سکتا تھا کہ اسی بہانے کچھ اشعار ان کے اردو میں اور اضافے ہو جاتے۔ خود صہبائی کا کہنا ہے:

"معلوم کیا چاہئے کہ یہ فن ایک شعبہ ہے بدیع کا اور معما ایک صنعت ہے صنائع لفظی سے لیکن از بسکہ اس فن کے قواعد اور فروع اس کے متکثرہ ہیں گویا براسہ ایک فن علحدہ معلوم ہوتا ہے اور یہ فن طبائع فہیم کے نزدیک الطف فنون کا اور الذ اشیا کا ہے۔ لیکن چونکہ بیشتر اشخاص کو بسبب دقت کے اس طرف رغبت کم ہے اس واسطے صاحب والا مناقب بوترس صاحب پرنسپل دام اقبالہ کا ارشاد اس طرح پر ہوا کہ اس فن کو ترک کرنا چاہئے۔ اس سبب سے مترجم بموجب اس عبارت کے المامور معذور اس حدیقہ کے ترجمہ سے ہاتھ اٹھا کر خاتمہ کا ترجمہ کرتا ہے۔" (ص ۱۵۷)

اس ترجمہ کا خاتمہ بھی سرقات شعری کے مباحث پر ہوتا ہے۔ اس میں مترجم نے قدرے تفصیل سے سرقات شعریہ کو بیان کیا ہے۔ اور اردو شعرا کے کلاموں سے بخوبی اس کی وضاحت کی ہے کہ سرقہ کسے کہا جائے گا اور کسے نہیں۔ کس شعر پر توارد کا اطلاق ہوتا ہے اور کس پر سرقہ کا۔ شعر کی چوری کیا ہے؟۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے صہبائی لکھتے ہیں:

"شعر کی چوری یہ ہے کہ دوسرے شاعر کے شعر کا مضمون فقط لے کر شعر میں باندھ لیں یا اس کا شعر اپنی طرف منسوب کر لیں۔" (ص ۱۵۷)

اس تعریف کے بعد یہ واضح کیا گیا ہے کہ وہ کون سا اصول، پیمانہ اور معیار ہے کہ اس کسوٹی پر پرکھنے کے بعد سرقہ صادق آجاتا ہے۔ صہبائی تحریر فرماتے ہیں:

"کسی کی مدح سخاوت یا شجاعت کی یا ہجو بخل یا نامردی کی۔ یہ چوری میں

داخل نہیں ۔ یعنی اگر کسی نے کسی کی سخاوت یا شجاعت کی مدح کی پھر دوسرے نے بھی انہیں میں سے کسی چیز کی مدح کی تو یہ نہیں کہیں گے کہ اس نے پہلے شاعر کا مضمون چرا لیا۔ کس واسطے کہ یہ امر عادت میں داخل ہو گیا ہے۔ انہیں چیزوں کی مدح بیان کریں گے فصیح اور غیر فصیح اس میں شریک ہے۔ لیکن وہ امور کہ ان اعتراض پر دلالت کریں مثل استعارہ اور تشبیہ اور کنایہ البتہ ان کا سرقہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر ایک شخص نے ایک تشبیہ یا استعارہ اختراع کیا اور دوسرے نے بھی اسی کو استعمال کیا تو کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اس پہلے شاعر کی تشبیہ یا استعارہ کو چرا لیا مگر بعض تشبیہیں یا استعارے ایسے ہیں کہ سب شعرا میں شائع ہو گئے ہیں مثلاً آنکھ کی تشبیہ نرگس یا زبان کی تشبیہ سوسن یا رخسار کی گل یا ماہ سے اور بہادر کی تشبیہ شیر سے یا سخی کی تشبیہ حاتم سے"۔ (ص ۱۵۷۔۱۵۸)

سرقہ اور عدم سرقہ کی تشریح کے بعد سرقہ کے اقسام پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ مترجم نے سرقہ کو ظاہر اور غیر ظاہر دونوں قسموں کے لحاظ سے بیان کیا ہے۔ پھر ظاہر اور غیر ظاہر کی علیحدہ علیحدہ قسمیں کی گئی ہیں: "سرقہ ظاہر" پر روشنی ڈالتے ہوئے صہبائی تحریر فرماتے ہیں:

"سرقہ ظاہر کئی قسم پر ہے۔ قسم اول کہ دوسرے شعر کو بغیر تغیر کے اپنا ٹھہرا لیں اس کو نسخ اور ابتحال کہتے ہیں۔ یہ سرقہ کمال معیوب ہے۔ اور اگر کوئی ایسا موزوں کرے کہ وہی بعینہ دوسرے کے دیوان میں نکل آوے اور اس کے کہنے والے کو اصلاً اس پر اطلاع نہ ہو، اس کو توارد کہتے ہیں نہ سرقہ اور یہ کمال تیزی فکر پر دلالت کرتا ہے۔

قسم دوسری یہ ہے کہ کسی کے مضمون کو تمام الفاظ یا بعضے الفاظ کو لے کر اس کی ترتیب بدل دیں اگر اول سے اس کی ترتیب بہتر ہو گی البتہ طبائع کے مقبول ہو جاوے جیسے درد کا یہ شعر

دیکھا نہ تھا تجھے جب ہم دیکھتے تھے سب کچھ جب آنکھ کھل گئی تو کچھ بھی نہ دیکھا ہم نے

اور اس شعر میں بعینہ وہ الفاظ موزوں کر لئے ہیں

دیکھا نہ تھا تجھے جب ہم دیکھتے تھے سب کچھ
جب ہم نے تجھ کو دیکھا پھر ہم نے کچھ نہ دیکھا

قسم تیسری یہ ہے کہ دوسرے کا مضمون لے کر اور الفاظ میں باندھ لیں جیسے یہ دو شعر سودا کے:

کیا تاب ہے جو منہ پہ ترے آوے آفتاب
دیکھے جو بھر نگاہ تو جل جاوے آفتاب
کرتی ہے مرے دل میں تری جلوہ گری رنگ
اس شیشہ میں ہر آن دکھاتی ہے پری رنگ

ان دو شعروں میں وہ دونوں مضمون بندھے ہیں

خورشید کو کیا طاقت جو سامنے وہ آوے
گرمی سے ترے رخ کی وہ صاف ہی جل جاوے
ترے جلوے سے میرے دل میں ہر دم برق کوندے ہے
پری کی شوخی رفتار اس شیشہ کو روندے ہے

اور سرقہ غیر ظاہر:

اول یہ ہے کہ معنی دو شعر کے آپس میں مشابہت رکھتے ہوں جیسے ان دو شعروں میں

گلشن دہر میں جوں خار ہے اب قدر مری
جس کے دامن سے لگوں وہ ہی چھڑاتا ہے مجھے
یوں کدورت مجھ سے ہے عالم کو مانند غبار
آسرا لوں جس کے دامن کا وہ دامن دے جھٹک

قسم دوسری یہ ہے کہ شعر اول میں ادعا خاص ہو اور دوسرے میں عام جیسے یہ دو شعر

گر صید گہہ میں باقی کوئی نہیں تو ظالم
گو صید ناتواں ہوں پر کر شکار مجھ کو
شاہا ترے شکار کو عالم میں اب نہیں
باقی بغیر نرگس خوباں کوئی غزال

پہلے شعر میں فقط صید گاہ کے شکاروں کی نفی ہے اور دوسرے میں تمام کے شکار کی۔

قسم تیسری یہ ہے کہ مضمون کو ایک جاے سے دوسری جاے میں نقل کریں جیسے ان دونوں شعروں میں جرأت کے

بہتر گل بازی کا دلا کاش تو پاتا
ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اُٹھاتا

شیخ ابراہیم ذوق

میرے زخموں میں پر کر دو نمک اب بچاؤ گے
گرے گا گر زمیں پر یہ آنکھوں سے اٹھاؤ گے

اول شعر میں نسبت آنکھوں سے اٹھانے کی گلبازی کی طرف ہے اور دوسرے میں نمک کی طرف۔

قسم چوتھی یہ ہے کہ دوسرے شعر کے معنی پہلے شعر کے معنی کے ضد ہوں جیسے ان دو شعروں میں

صندلی رنگ پہ میں مر ہی گیا درد سر کیا کہ اب وہ سر ہی گیا
صندلی رنگوں پہ کیا دیں جان ہم کس کو ہے اس درد سر کا اب دماغ

قسم پانچویں یہ ہے کہ کسی اور مضمون سے کچھ لے کر اور چیزیں ایسی بڑھادیں

کہ بہ نسبت اول کے زیادہ لطف ہو جاوے۔ جیسے ان شعروں میں۔ شعر اول مومنؔ کا

خوں بہا قاتل بے رحم سے مانگا کس نے　　　　کہ فرشتے مجھے یاں داغ درم دیتے ہیں

دوسرا شعر شیخ ابراہیم ذوقؔ کا

کہتی تھی ماہی بریاں کہ دبیران قضا
داغ دیتے ہیں اسے جس کو درم دیتے ہیں"

اتنا سب لکھنے کے بعد بہت ہی محتاط انداز میں صہبائی فرماتے ہیں کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ سرقہ سرزد ہوا ہے۔ اس وقت تک سرقہ کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ توارد ہو۔ صہبائی لکھتے ہیں:

"جب یہ معلوم ہو جاوے کہ دوسرے شخص نے پہلے شعر میں اس مضمون کو چرا لیا ہے۔ اس وقت اس پر سرقہ کا حکم کریں گے ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ بطریق توارد کے ہو اور ان مثالوں کے اشعار کا بھی یہی حال ہے۔" (ص ۱۶۰)

سرقہ کے علاوہ تضمین واقتباس پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ سارے مباحث صہبائی کی اردو دانی اور ان کی عروض و قوافی نگاری کے بین شاہد ہیں۔ نیز انہوں نے نہ صرف یہ کہ ترجمہ کے فرائض انجام دیے ہیں بلکہ بڑی جانفشانی اور تندہی سے اردو اشعار بھی درج کیے ہیں، جس کے لئے ان کو بہت ساری کتابوں، کلیات اور دواوین شعرا کا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ اس کے باوجود ان کی علمی دیانت داری کی تعریف کرنی ہوگی کہ اتنی محنت و مشقت کرنے کے باوجود بھی انہوں نے اسے ترجمہ ہی کہا ہے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو اس کا کوئی دوسرا نام رکھ سکتے تھے اور اگر ایسا کرتے تو اس میں وہ حق بجانب ہوتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ جب کہ انہوں نے جا بجا اضافے بھی کیے ہیں اور میر شمس الدین فقیر کے تسامحات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ بعض اصطلاحات جو کہ حدایق البلاغت میں شامل نہیں ہو پائے تھے، اردو کی

مناسبت سے اسے بھی شامل کتاب کیا گیا ہے اور بڑی جانفشانی اور محنت و لگن سے عربی اور فارسی اشعار کی جگہ اردو اشعار نقل کیے گیے ہیں۔ یہ ساری خصوصیات اور امتیازات بذات خود اس ترجمہ کو ایک مستقل بالذات تصنیف بنانے کے لئے کافی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ نرا ترجمہ ہی نہیں بلکہ صہبائی کی ایک مستقل تصنیف ہے اور ان کی کدو کاوش کا عظیم ثمرہ ہے، جو انہیں اردو کا پہلا عروض داں ثابت کرتی ہے۔

عام طور سے یہ ترجمہ حدایق البلاغت ہی کے نام سے علمی و ادبی دنیا میں معروف و مشہور ہے۔ لیکن قاضی محمد سعید نے "فہرست نمائش" میں جو اردو مخطوطات سیمنار منعقدہ خدا بخش لائبریری کے لئے تیار کی گئی تھی، اس کو "ہدایت البلاغت" کے عنوان سے موسوم کیا ہے (۱۰) یہاں یہ حقیقت بھی نظروں کے سامنے رہے کہ اس "فہرست نمائش" کے اصلی مرتب قاضی عبدالودود مرحوم ہیں۔ اس لئے اس کو قاضی صاحب ہی کی تالیف مانی جائے گی۔ بہر کیف قاضی صاحب کا یہ لکھنا کہ "ہدایت البلاغت غالباً صہبائی کا ترجمہ" درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس نام سے صہبائی کی کوئی کتاب نہیں ملتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ ورنہ وہ اس تسامح کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اس تسامح کی وجہ یہ ہے کہ کاتب نے غلطی سے "ہدایت البلاغت" لکھ دیا ہے۔ اسی کو قاضی صاحب نے درست مان لیا۔ قبلاً یہ مخطوطہ ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ کی ملکیت تھا۔ جس کے کرتادھرتا خود قاضی صاحب تھے۔ اب اس کا سارا ذخیرہ خدا بخش لائبریری میں آگیا ہے۔ جب میں نے اس مخطوطہ کو نکلوا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس نسخہ میں صہبائی کا دیباچہ نہیں ہے۔ البتہ خاتمہ موجود ہے اور خاتمہ میں صہبائی نے اسے ترجمہ حدایق البلاغت ہی کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ اس لئے ہدایت البلاغت نام دینا درست نہیں ہے۔

بہر کیف اس ترجمہ کے مجموعی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نظم و نثر اور اس کے رموز و نکات اور مسائل و معاملات پر صہبائی کی گہری نظر تھی۔ اور جس سے

ان کے فکر کی بالیدگی اور نظر کی گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ اردو زبان و ادب سے ان کو کس درجہ شغف تھا۔ الغرض یہ ترجمہ صہبائی کا ایک شاہکار ہے اور ان کی قادر الکلامی اور اردو دوستی کا شاہد ہے جس سے کوئی صاحب علم مستغنی نہیں ہو سکتا۔ خود صہبائی کو اس کا احساس تھا کہ اس ترجمہ سے اردو داں حضرات نے کافی استفادہ کیا ہے۔ اس بابت لکھتے ہیں:

"الحق کہ حدایق البلاغت شمس الدین فقیر کی کہ عبارت اس کی فارسی ہے، طالب علم کے سوا کوئی اس کو ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور جب سے اس احقر نے بموجب فرمائش صاحب ممدوح (بوترس) کے اردو میں ترجمہ کیا اکثر کم استعدادوں نے جن کو فن شعر سے مناسبت تھی اس کو بہم پہونچا کر کچھ کچھ فائدہ اٹھایا۔" (۱۱)

ترجمہ حدایق البلاغت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ صہبائی کی ایک خوبی اور نکھر کر سامنے آتی ہے اور وہ ان کی اردو شاعری ہے۔ حالانکہ اردو شاعری سے متعلق کوئی مستقل کتاب صہبائی کی نہیں ہے۔ پھر بھی بعض حضرات نے اس ترجمہ کے ذریعہ ان کے بعض اردو اشعار کی نشاندہی کی ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو آئندہ ہوگی۔

حواشی:

۱۔ گلشن بیخار ص ۱۵۲　۲۔ سیر المصنفین ۱/ ۲۳۵　۳۔ داستان تاریخ اردو ص ۲۰۳
۴۔ طبقات الشعراص ۴۱۳　۵۔ داستان تاریخ اردو ص ۲۰۳　۶۔ خطبات ص ۹۵
۷۔ سیر المصنفین ۱/ ۲۳۶　۸۔ ترجمہ حدایق البلاغت از مولانا محمد ادریس ص الف
۹۔ غالب اور صفیر ص ۱۷　۱۰۔ فہرست نمائش ص ۱۱۷
۱۱۔ رسالہ قواعد صرف و نحو اردو، ص ۳

صہبائی بحیثیت تذکرہ نگار

اردو کے باب میں صہبائی کی دوسری اہم خدمت جو بعض معاملوں میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے "انتخاب دواوین" ہے۔ عرصہ تک صہبائی کی یہ کاوش نظروں سے اوجھل رہی۔ صرف تذکروں میں اس کا نام ملتا تھا لیکن اب منظر عام پر آچکی ہے۔ اردو تذکرے کے باب میں اس تذکرہ کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

اردو میں تذکرہ نویسی نے مختلف اسباب کے تحت مختلف ادوار میں نشوونما پائی۔ کہیں پر سیاسی حالات معاون ہوئے تو کہیں محض شعری شوق کی تشنگی مددگار ثابت ہوئی اور کہیں تنقید و تبصرہ اور تاریخی ضروریات۔ ان جیسی بہت سی ضرورتوں نے تذکرہ نگاری کو جنم دیا۔ قدیم تذکروں میں بجز مولوی کریم الدین کے کسی نے بھی تذکرہ اور تذکرہ نگاری کی معنوی وسعت و حدود کے تعین کی طرف دھیان نہیں دیا ہے۔ کریم الدین کے مطابق کتب تذکرہ اور طبقات تاریخ کی شاخیں ہیں اس اعتبار سے "تذکرہ خاص ہے اور تاریخ عام ہے کہ وہ تذکروں کو بھی مشتمل ہوتی ہے۔ تاریخ میں بحث واقعات زمانہ سے ہوتی ہے اور تذکرے میں اشخاص کا بیان ہوتا ہے (۱)۔"

تذکرہ دراصل بیاض کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ابتداءً بیاض میں صرف اشعار کا انتخاب ہوتا تھا اور جب اس میں شعرا کا نام اور تخلص کا اضافہ کر دیا گیا تو اسی کا نام تذکرہ ہو گیا۔ چنانچہ فارسی و اردو کے قدیم تذکروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام طور پر تذکرے بیاض اشعار کے ڈھب پر مرتب کئے گئے ہیں اور زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ یہی بیاض سے آگے بڑھ کر نیم تاریخی، نیم تنقیدی اور نیم سوانحی فضا میں داخل ہو گیا۔

اردو میں شعراء کی تذکرہ نگاری کا آغاز فارسی کے زیر اثر تقریباً ۱۸ویں صدی عیسوی کے وسط سے ہوتا ہے اور "آب حیات" مؤلفہ ۱۸۸۰ء تک برابر قائم رہتا ہے۔

اس کے بعد حقیقتاً تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مغرب کے زیر اثر تنقید، تاریخ اور سوانحی خاکہ نگاری لے لیتی ہے۔

اردو شعراء کے تذکرے کی زبان عام طور پر فارسی رہی۔ چنانچہ ۱۸۰۱ء سے قبل کوئی بھی تذکرہ ایسا نہیں ملتا ہے جس کی زبان اردو رہی ہو۔ مولوی عبدالحق تذکرہ نگاری کے اس رویہ سے کافی نالاں نظر آتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"یہ بات نہایت حیرت انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی کہ اردو شاعروں کے تمام اہم پرانے تذکرے اور بالخصوص ۱۲ ویں صدی ہجری کے تمام تذکرے فارسی میں لکھے گئے۔ اردو تذکرہ نگاروں نے فارسی کی تقلید میں اردو تذکروں کا انداز اور طریقہ تو اپنایا ہی تھا جس کے بہت سے جواز پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن یہ یقیناً افسوسناک ہے کہ ان کی زبان بھی فارسی ہی رہنے دی گئی" (۲)

ان تذکروں کی محی الدین قادری زور، گارساں دتاسی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، شمس اللہ قادری، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بلحاظ ہیئت، مواد، زبان اور زمانہ مختلف تقسیمیں کی ہیں۔ وہ سب اپنی جگہ پر ہیں اور ان کو زاید خانوں میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے البتہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری اپنے بلحاظ زمانہ جو تقسیمیں کی ہیں وہ قابل التفات ہیں۔ انہوں نے تذکروں کی دو موٹی تقسیمیں (اٹھارہویں صدی عیسوی کے تذکرے اور انیسویں صدی عیسوی کے تذکرے) کی ہیں۔ ان دونوں تذکروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری تحریر فرماتے ہیں:

"اٹھارہویں صدی عیسوی کے تذکرے، انیسویں صدی عیسوی کے تذکروں کے مقابلے میں عموماً مختصر ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر سب کے تراجم کی نوعیت بھی تقریباً ایک سی ہے۔ کلام کی معنوی حیثیت کے بارے میں ذاتی رائیں تقریباً مفقود ہیں۔ میر کے سوا اس طرف کسی نے زیادہ توجہ

نہیں کی۔ عموماً ایک ہی قسم کے تعریفی کلمات سے ہر شاعر کو نوازا گیا ہے۔
بہ حیثیت مجموعی اٹھارہویں صدی عیسوی کے تذکروں پر فارسی کی چھاپ
بہت گہری ہے۔ انیسویں صدی میں سب سے نمایاں اور اہم بات یہ ہوئی
کہ اردو شعراء کے تذکرے فارسی زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھے
جانے لگے۔ تذکرہ نگاری کی قدیم روش میں بھی نمایاں تبدیلیاں ہونے
لگیں۔ گویا انیسویں صدی میں تذکرہ نگاری دستاویزی شہادتوں اور کارآمد
حوالوں کی بدولت بیاض سے بہت آگے بڑھ کر ادبی تنقید، ادبی تاریخ اور
ادبی سوانح نگاری کے حدود میں داخل ہوگئی۔ اس کوشش نے انیسویں
صدی کے تذکروں میں خاصا تنوع پیدا کر دیا ہے۔ یہ تنوع مواد اور ہیئت
دونوں میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محسن کے "سراپا سخن" سعادت خاں
ناصر کے "خوش معرکہ زیبا" نساخ کے "قطعہ منتخب" مہجور کے "مدائح
الشعرا"، صہبائی کے "انتخاب دواوین" اور یکتا کے "دستور الفصاحت" کے
طرز کے تذکرے اٹھارہویں صدی میں نظر نہیں آتے... ایک اہم اضافہ
یہ نظر آتا ہے کہ ان تذکروں میں شعراء کے حالات زندگی اور انتخاب کلام
کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے مروجہ موضوعات و مسائل پر بھی بحثیں
چھیڑی گئی ہیں" (۳)

"انتخاب دواوین" کی تالیف تک کم و بیش ۴۴ تذکرے لکھے جا چکے تھے۔ ان میں متفقہ طور پر "نکات الشعرا" کو اردو شعرا کا پہلا تذکرہ مانا جاتا ہے۔ البتہ چند تذکرے میر کے قبل بھی لکھے گئے مثلاً تذکرہ سید امام الدین خاں بعہد محمد شاہ، جس کا حوالہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں دیا ہے (۴)۔ تذکرہ خاں آرزو، مگر یہ تذکرہ فارسی شعرا کا ہے۔ تذکرۂ سودا، اس کا حوالہ دو جگہ قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے "مجموعۂ نغز" میں دیا ہے (۵) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

غالباً انہوں نے قائم کے تذکرے کو سودا کا سمجھا ہے (۶) چونکہ آج یہ ناپید ہیں۔ اس لئے "نکات الشعرا" کو ہی اردو شعرا کے دوسرے تذکروں میں مقدم کیا جاتا ہے۔

انتخاب دواوین سے قبل جتنے تذکرے لکھے گئے ان کے مجموعی مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شعرائے اردو کے تذکرے ہمارے ادب کا ایک ناقابل فراموش سرمایہ ہیں، جن کی مدد سے ہم تذکرہ نگاروں کے عہد کے معاشرتی ماحول، تہذیبی قدروں، ادبی روایات، شعرا کی سوانح اور ان کے شعری رجحان کا بخوبی پتا لگا سکتے ہیں۔

انتخاب دواوین کی خصوصیات

کم و بیش ۳۴ تذکرے لکھے جانے کے بعد "انتخاب دواوین" کی تالیف عمل میں آئی۔ یہ تذکرہ اردو شعر و ادب کی تاریخ کا ایک اہم ادبی دستاویز ہے جس کے بغیر ہمارے ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

صہبائی کی یہ نادر اور وقیع تالیف ۱۸۴۲ء میں معرض وجود میں آئی اور اس کے دو سال بعد یعنی ۱۸۴۴ء میں زیور طباعت سے مزین ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن چار پانچ سال کے بعد ۱۸۴۹ء میں منظر عام پر آیا البتہ بہت دنوں تک یہ کتاب اہل علم و ادب کی نظروں سے اوجھل رہی حالانکہ متعدد تذکرہ نگار اسکی نشاندہی کر چکے تھے کہ صہبائی کی تصانیف میں "انتخاب دواوین" بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں مولوی کریم الدین لکھتے ہیں "مولوی امام بخش صہبائی نے ایک انتخاب دواوین واسطے سوسائٹی چھپوایا ہے" (۷)

گارساں دتاسی نے بھی اسکی بابت اطلاع دی تھی "انتخاب دواوین شعرائے مشہور زبان اردو کا، اس کے مؤلف امام بخش صہبائی پروفیسر دہلی کالج ہیں" (۸)

مولوی ذکاءاللہ کی بھی یہی رائے تھی کہ:

''انتخاب دواوین، مولوی امام بخش صہبائی کی تصنیف سے ہے''(۹)۔

البتہ بہت دنوں تک یہ تذکرہ اہل علم و ادب کی دسترس سے باہر رہا۔ خود ضیاء احمد بدایونی اس سے نا آشنا تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''رہا ان کا مرتبہ ''تذکرہ شعرائے اردو'' اور ''اردو صرف و نحو'' جن کا گارساں دتاسی نے ذکر کیا ہے چونکہ یہ دونوں فی الحال ہماری دسترس میں نہیں ہیں لہٰذا ان پر تبصرہ کرنا متعذر ہے''(۱۰)

اہل علم و ادب برابر اس کی تلاش میں رہے اور اس سلسلے میں کامیابی ڈاکٹر تنویر احمد علوی کو ملی۔ ڈاکٹر علوی لکھتے ہیں:

''اس کے نسخے بہت کمیاب ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں سفر حیدر آباد کے دوران راقم الحروف نے عاریتاً اسے کچھ وقت کیلئے جامعہ عثمانیہ کی لائبریری سے حاصل کیا اور دہلی میں اس کا زیراکس کرایا... میں نے اس کی اشاعت کے سلسلے میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر فضل الحق اور شعبے کے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اردوئے معلّٰی سیریز میں اس کی شمولیت اور شعبے کی طرف سے اس کی اشاعت کے مسئلہ سے اتفاق کیا''(۱۱)

میرے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا مرتب کردہ ہے اس کی اشاعت ۱۹۸۷ء میں شعبہ اردو، دلی یونیورسٹی کے اہتمام سے عمل میں آئی۔ یہ ۳۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ آغاز میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا پیش لفظ ہے۔ اسکے بعد مرتب کا حرف آغاز ہے۔ پھر مشتملات اور ''انتخاب دواوین'' کے عنوان سے مرتب کا مقالہ شامل ہے۔ اس کے بعد مرتب نے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا مضمون ''مولانا امام بخش صہبائی اور ان کی تالیف انتخاب دواوین'' بھی شامل کر دیا ہے۔ اصل متن ص ۴۹ سے شروع ہوتا ہے۔

جس نسخہ سے ڈاکٹر علوی نے استفادہ کیا ہے اسکے سرورق پر مندرجہ ذیل معلومات فراہم کی گئی ہیں:

SELECTION FROM THE MOST CELEBRATED HINDOSTANI POETS

VIZ

WALI, DARD, SAUDA, MEER TAKEE , JOORUT, MEER HASSUN, NASSEER, MUMNOON, NASIEK, MOOL CHAND, ZOUK, MOUMEEN KHAN

WITH

A FEW POPULAR SONGS AND AN INTRODUCTION ON THE DIFFERENT KINDS OF HINDEE VERSE BY MOONSHEE IMAM BUX OF THE DELHI COLLEGE

انتخاب دیوانوں، شعراء مشہور زبان اردو کا اور بعض گیت کا معہ بیان ہر قسم کے شعر کے مولوی امام بخش مدرس اول فارسی مدرسہ ھذا نے ۱۸۴۴ء میں کیا۔

دہلی اردو اخبار پریس مکان مولوی محمد باقر صاحب واقع گذر اعتقاد خاں میں باہتمام پنڈت موتی لعل پرنٹر اور پبلشر کے چھاپہ ہوا ۱۸۴۴ء" (۱۲)

تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتخاب ایک سے زائد بار طبع ہوا تھا۔ گارساں دتاسی اور مولوی ذکاءاللہ کے مطابق ۱۲۶۰/ ۱۸۴۲ءاور مولوی کریم الدین کے مطابق ۱۸۴۴ء میں ۔ اس سلسلے میں گارساں دتاسی اور مولوی ذکاءاللہ کی اطلاع درست نہیں معلوم ہوتی ہے ۔ کیونکہ ۱۸۴۲ء اس کا سال تالیف ہے نہ کہ سال اشاعت اور دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے ۱۲۶۰ھ کا مطابق ۱۸۴۲ء لکھا ہے جبکہ ۱۲۶۰ھ کا عیسوی مطابق ۱۸۴۴ء ہے نہ کہ ۱۸۴۲ء۔ اس لئے اس کو ۱۸۴۴ء ہی سمجھا جائے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۹ء میں مطبع العلوم دہلی سے نکلا تھا۔

تالیف کا اصل اور بنیادی مقصد ممتاز شعراء کے کلام کا انتخاب تھا نہ کہ شعراء کا تذکرہ۔ چونکہ صہبائی نے اس انتخاب میں شاعروں کے ضروری حالات بھی درج

کردیئے ہیں۔ اس لئے اس کو تذکرہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں گارساں دتاسی کا خیال ہے کہ:

"اسے ہم محض انتخاب نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ انتخابات کے ساتھ ساتھ شاعروں کے مختصر حالات بھی درج ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا تذکرہ ہے۔ یہ حالات اردو زبان میں ہیں" (۱۳)۔

مولوی ذکاءاللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اگرچہ انتخاب دواوین ہے یعنی شاعروں کے دیوان میں سے اشعار چھانٹ چھانٹ کر لکھ دیئے۔ لیکن اس میں کچھ کچھ شاعروں کا بھی حال ہے اس سبب سے اس پر تعریف تذکرہ کی صادق آتی ہے" (۱۴)

ڈاکٹر سید عبداللہ کی بھی تقریباً یہی رائے ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ:

"ہر چند کہ اس کو خلاصہ یا انتخاب کہا گیا ہے مگر یہ انتخاب سے کچھ زیادہ ہے۔ کیونکہ ہر شاعر کے کلام کے ساتھ اس کے کچھ حالات بھی درج کئے گئے ہیں" (۱۵)۔

اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

"ہر انتخاب سے پہلے شاعر کا تعارف نامہ ہے جو اگرچہ مختصر ہے اور اس میں تذکرہ احوال پر مرتب نے کافی وشافی توجہ بھی نہیں کی لیکن ان نگارشات کے باعث انتخاب میں تذکروں جیسا ایک انداز ضرور آگیا ہے" (۱۶)۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ صرف انتخاب کے زمرہ میں نہیں آتا بلکہ تذکرہ کی تعریف بھی اس پر صادق آتی ہے۔ حالانکہ خود صہبائی نے اس کو انتخاب ہی مانا ہے انہوں نے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"دواوین اردو میں ہر صنف کے اشعار انتخاب ہو کر ایک مجموعہ مرتب

ہوا تا کہ ناظرین کو اکثر شعراء کے کلام سے ایک جائے میں احتظاظ وافر اور التذاذ متکاثر حاصل ہو'' (۱۷)

صہبائی نے آغاز میں ۳۱ صفحوں پر مشتمل ایک وقیع مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں ہندستانی شاعری اور اس زبان کی خاص خاص نظموں کی بحروں پر بحث کی ہے اور مختلف اصناف سخن کی تعریف کے ساتھ ساتھ بہت اچھی مثالیں بھی دی ہیں۔ انتخاب کا یہ حصہ نہایت بیش قیمت ہے۔ کیونکہ صہبائی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو میں اول اول اس پر خامہ فرسائی کی۔ حالانکہ ان سے قبل گارساں دتاسی اس پر روشنی ڈال چکے تھے چونکہ یہ فرانسیسی زبان میں تھا اس لئے اردو کے باب میں اولیت صہبائی کو حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ انتخاب کے اس حصہ کی افادیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس تذکرے کے متعلق ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں اردو شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے جس میں جدید رنگ جھلکتا ہے'' (۱۸)

اس کی مزید وضاحت ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''اس کتاب کا جو حصہ نہایت بیش قیمت ہے وہ اس کا دیباچہ ہے ان امور پر اس سے پہلے گارسین دتاسی کے سوا کسی اور تذکرہ نگار نے روشنی نہیں ڈالی ہے۔ ہاں بعد کے تذکرہ نگاروں میں .کریم الدین کے طبقات شعرائے ہند اور گلدستہ نازنیناں یا صابر کے گلستان سخن اور صفا کے شمیم سخن میں زبان وادب کے متعلق اس نوع کے مقدمات شامل ہیں۔'' (۱۹)

اس کتاب کی تالیف کے وقت صہبائی کو احساس تھا کہ عام قاری ہر صنف شعر کی تعریف سے نابلد ہوتے ہیں اس لئے انہوں نے ابتداء میں چند اوراق اسی پر سیاہ کئے ہیں۔ صہبائی خود تحریر فرماتے ہیں:

> ''از بسکہ مبتدیان کو ہر صنف شعر کی تعریف پر اطلاع نہیں ہوتی اس

واسطے پہلے چند ورق اس باب میں سیاہ کیے جاتے ہیں" (۲۰)

بطور نمونہ ان تعریفات کو لکھا جاتا ہے جنہیں صہبائی نے مختلف صنف شعر کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے شعر کی ہیئت و ماہیت پر روشنی ڈالی ہے:

"... شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں اور اصطلاح شعراء میں ایک کلام ہے کہ وزن اور قافیہ رکھتا ہو اور شاعر نے اس کو شعر کے قصد سے کہا ہو پس اگر ایک کلمہ ہو یا زیادہ ہو یا کوئی وزن، اوزان مقررہ میں سے یا قافیہ نہ رکھتا ہو یا شاعر نے اس کو شعر کے قصد پر نہ کہا ہو۔ موافق اصطلاح کے وہ شعر نہیں اور یہاں معلوم ہوا کہ ردیف شعر کی خاصیت میں داخل نہیں پس شعر بدون قافیہ کے تمام نہیں ہو سکتا اور بدون ردیف کے تمام ہو سکتا ہے اور یہ مذہب ہے جمہور کا" (۲۱)

اس تعریف کے بعد انہوں نے کلام الٰہی کی آیتوں اور احادیث کو شعر سے خارج کر دیا ہے پھر اولین واضع شعر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بعدہ نظم کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"... نظم باعتبار قافیہ اور وزن اور قلت اور کثرت مصرعوں کے کئی قسم ہو جاتا ہے (کذا) اور کئی قسم علحدہ ہو جاتی ہیں اس (میں) نظم کے معنی کو بھی دخل ہوتا ہے۔... بہرکیف ان اعتبارات سے نظم کی یہ قسمیں ہیں: فرد، غزل، قصیدہ، تشبیب، قطعہ، رباعی، مثنوی، ترجیع بند، مسمط، مستزاد، واسوخت" (۲۲)

فرد اور بیت کی تعریف:

"فرد دو مصرع کے شعر کو کہتے ہیں مطلقاً خواہ دونوں مصرعے میں قافیہ ہو خواہ ایک میں اور اس کو بیت بھی کہتے ہیں لیکن ان دونوں ناموں میں اس

قدر فرق ہے کہ شعر کے تنہا ہونے کی صورت میں فرد نام رکھا جاتا ہے اور بیت خواہ تنہا ہو خواہ منجملہ اور اشعار کے ... فرد خاص ہے اور بیت عام۔" (۲۳)

غزل کی تعریف:

"غزل لغت میں عورتوں کی باتیں اور عورتوں کے عشق کی باتیں کرنے کو اور اس سخن کو بھی کہتے ہیں جو عورتوں کی تعریف میں کہا جاوے اور اصطلاح میں کئی بیتوں کا نام ہے سب کا وزن ایک ہو اور پہلی بیت کے دونوں مصرع ہم قافیہ ہوں اور باقی ابیات کے دوسرے مصرعے۔ پہلی بیت کو مطلع کہتے ہیں اور دوسری بیت کو جو مطلع کے بعد ہے حسن مطلع اور بیت اخیر کو مقطع" (۲۴)۔

اس ضمن میں صہبائی نے عربوں اور فارسیوں کے معیار عشق یعنی ان دونوں ملکوں میں کس کا عشق کس پر ہوتا ہے، پر روشنی ڈالی ہے اور غزل کے حدود مضامین اور تعداد بھی متعین کئے ہیں۔

قصیدہ کی تعریف:

"قصیدہ لغت میں مغز غلیظ کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ایک کلام ہے اتحاد وزن اور قافیہ مثل غزل کے مگر اتنا فرق ہے کہ اشعار اس کے گیارہ بارہ بیت سے زیادہ نہیں چاہیے اور قصیدہ کے واسطے ابیات کی حد کچھ معین نہیں (۲۵)۔" ضمناً قصیدہ کے مضامین بھی بیان کیے گئے ہیں۔

تشبیب کی تعریف:

"تشبیب کے معنی ایام جوانی کا ذکر کرنا اور نسیب عورتوں کا ذکر کرنا۔

اس نام سے معلوم ہوا کہ اول یہ ہی رسم تھی کہ قبل از مقصود اشعار عاشقانہ لکھتے تھے لیکن اب خصوصیت ایسے اشعار کی نہیں رہی بلکہ مقصود سے پہلے جس قسم کے شعر ہوں ان کو تشبیب کہیں گے"۔(۲۶)

قطعہ کی تعریف:

"قطعہ لغت میں کسی چیز کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں ان چند بیت کا نام ہے کہ وزن اور قافیہ میں متحد ہوں مثل غزل کے لیکن مطلع نہ ہو"(۲۷)

اس کے بعد، قطعہ، غزل اور قصیدہ کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

رباعی کی تعریف:

"رباعی دو بیت ہیں کہ مصرع اول اور دوم اور چہارم ہم قافیہ ہوتا ہے اور کبھی چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔اس کو چار مصراعی اور بیتی بھی کہتے ہیں اور رباعی کے واسطے چوبیس وزن مقرر ہیں۔اگر وہ چار مصرے ان اوزان میں سے کسی وزن پر ہوں پس اس کو رباعی کہیں گے ورنہ ہر چار مصرعے کو رباعی کہنا درست نہیں ہے۔"(۲۸)

مثنوی کی تعریف:

"مثنوی ایسی بیتیں ہیں کہ وزن سب کا علیحدہ اور قافیہ دو دو مصرع کا متفق اور ہر بیت قافیہ جداگانہ رکھتی ہے حد مثنوی کی معین نہیں جیسے اردو میں مثنوی میر حسن کی جس میں بدر منیر اور بے نظیر کا قصہ مسطور اور تمام عالم میں مثل بدر منیر کے مشہور ہے اور مثنوی اکثر ان سات وزن میں سے

کسی وزن پر ہوتی ہے۔"(۲۹)

اس تعریف کے بعد صہبائی نے ان سات وزنوں کی مع امثلہ تشریح کی ہے۔

ترجیع بند اور ترکیب بند کی تعریف:

"ترجیع بند لغت میں اولٹنے اور پھیرنے کے ہیں اور اصطلاح میں وہ چند شعر کہ خانہ خانہ ہوویں اور ہر خانہ ایک غزل کے برابر ہو۔ قافیہ اس خانہ کا بعینہ مانند قافیہ غزل کے یعنی مطلع کے دونوں مصرع اور باقی ابیات کے بھی مصرع ہم قافیہ ہوں اور قافیہ ایک خانہ کا دوسرے خانہ کے قافیہ سے مخالف ہو اور تمام ہونے کے بعد ایک اجنبی بیت لاویں اور چاہیے کہ وہ بیت اجنبی باعتبار معنی کے پہلی بیتوں سے ربط رکھتی ہو پس اگر بند کی بیت بار بار بعینہ مکرر ہو اوس کو ترجیع بند کہتے ہیں اور اگر مختلف ہو تو ترکیب بند اور ترکیب بند دو طرح ہے ایک یہ کہ بند کی ہر بیت کا قافیہ علحدہ ہو... اور دوسرے یہ کہ سب بیتیں ایک قافیہ پر ہوں۔"(۳۰)

مسمط کی تعریف:

"مسمط لغت میں موتی کی لڑی کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں اس طرح کی نظم کو کہتے ہیں اول چند مصرع قافیہ میں متفق ہوں اور بعد اس کے اس قدر مصرع اور اس طرح کے ہوں کہ قافیہ مصرع اخیر کا موافق ان چند مصرع کے ہو اور باقی مصرعوں کا ان سے مخالف ..."(۳۱)

اس ضمن میں صہبائی نے مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن اور متسع اور معشر کی نشاندہی کی ہے۔

مستزاد کی تعریف:

"مستزاد ایسی نظم کو کہتے ہیں کہ بعد ہر مصرع یا بیت کے ایک فقرہ نثر کا زیادہ کریں لیکن بشرطیکہ وہ فقرہ اس نظم سے باعتبار معنی کے مربوط ہو اور وہ نظم بغیر اس فقرہ کے بھی تمام ہو سکتا ہو (کذا) یعنی اگر وہ فقرہ نہ ہو تب بھی معنی نظم کے درست ہوں۔" (۳۲)

واسوخت کی تعریف:

"واسوخت لغت میں بمعنی بیزار ہونے کے ہے اور اصطلاح میں ایسے اشعار کو کہتے ہیں کہ اوس میں معشوق سے بیزاری کا مضمون ہو اور فی الحقیقت واسوخت اصناف شعر میں سے کوئی صنف علحدہ نہیں ہے بلکہ مضامین شعریہ میں سے ایک مضمون ہے کہ اس کو اصناف مذکورہ میں سے جس صنف میں چاہیں استعمال کر لیں لیکن اغلب واسوخت مسدس یا ترجیع بند نظر میں آتے ہیں"۔ (۳۳)

ان تعریفات کے بعد تقریباً ۱۹ صفحات میں ان تمام صنفوں کی مثالیں شعراء کے کلام سے پیش کی گئی ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صہبائی کا یہ مقدمہ محض درسی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور بظاہر اس میں کوئی نئی بات نہیں دکھائی دیتی ہے جو اہل علم اور صاحب فضل کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ خود صہبائی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ مقدمہ مبتدیوں کے لئے لکھا گیا ہے لہٰذا اس میں چونکا دینے والی بات کی خواہش کرنا صہبائی کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ البتہ اگر وہ چاہتے تو اس کو اور وقیع بنا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ خامیاں بھی اس مقدمہ میں نظر آتی ہیں جو آگے بیان کی جائیں گی تاہم اس اعتبار

سے اس کو اہمیت دی جانی چاہیے کہ اردو تذکروں میں یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں اس قسم کی بحثیں اردو زبان میں شامل کی گئی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبداللہ، دتاسی، کریم الدین اور صہبائی کے تذکروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سوانحیت کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ اردو شاعری کا ارتقاء بھی مطالعہ میں آجائے۔" (۳۴)

صہبائی نے اپنے اس تذکرہ میں صرف ۱۲ نمائندہ شعراء کو شامل کیا ہے۔ شعراء میں ولی (ص ۸۰-۹٦)، درد (ص ۹٦-۱۲۹)، سودا (ص ۱۳۰-۱٦۷)، میر تقی (ص ۱٦۷-۱۹۹)، جرأت (ص ۱۹۹-۲۳٦)، میر حسن (ص ۲۳٦-۲۴۸)، نصیر (ص ۲۴۸-۲٦۳)، ممنون (ص ۲٦۴-۲۸۵)، ناسخ (ص ۲۸٦-۳۲۲)، ذوق (ص ۳۲۲-۳۴۹)، مومن (ص ۳۴۹-۳٦۳) ہیں۔ اس کے بعد ص ۳٦۴ سے ۳۷۰ تک گیت اور ٹھمری کا انتخاب ہے۔ جس میں جرأت کی نوغزلیں اور دیگر اشعار جن میں ایک برج گیت کے بول گیت خیال کے عنوان سے، ایک پنجابی گیت پٹہ کے نام سے اور دو گیت ملار کے نام سے درج کئے گئے ہیں۔

گیتوں کی شمولیت صہبائی کے اس رجحان اور میلان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ اس صنف سخن کو بھی سنجیدہ علمی صنفوں میں شمار کرتے تھے۔ اس سے قدیم ادبی روایات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

"گیتوں کی شمولیت صہبائی کے اس رجحان اور میلان کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس صنف سخن کو سنجیدہ علمی صنفوں میں شمار کرتے تھے اور یہ اہم بات ہے کہ صہبائی گیتوں کی روایت کو اردو ادبیات کا حصہ سمجھتے تھے۔ اسی لئے بطور ضمیمہ گیتوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔" (۳۵)

اس تذکرہ میں شعراء کی ترتیب بلحاظ زمانہ قائم کی گئی ہے البتہ قدیم کے ساتھ

ساتھ معاصر شعراء بھی اس میں جگہ پا گئے ہیں لیکن صہبائی نے اپنے معاصرین کے متعلق چند سطریں ہی درج کی ہیں اگر چاہتے تو وہ شافی و کافی حالات لکھ سکتے تھے چونکہ یہ ان کے دائرۂ کار سے باہر تھا اس لئے انہوں نے اس پہلو پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ انہوں نے غالبؔ کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے جبکہ ذوقؔ اور مومنؔ جو غالبؔ اور خود صہبائیؔ کے معاصر تھے اس میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

> "کسی شاعر کے کلام کا انتخاب دس بارہ صفحہ سے کم میں نہیں ہے ہر صفحہ میں بیس اشعار ہیں۔ شعراء کے حالات بھی درج ہیں لیکن مختصر نصف صفحہ سے زیادہ کسی کے متعلق نہیں لکھا دوسرے شعراء مثلاً غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ جن سے صہبائیؔ بخوبی واقف تھے ان کے متعلق بھی چند سطریں ہیں۔" (۳۶)

یہاں ڈاکٹر موصوف سے سہو ہو گیا ہے انہوں نے ذوقؔ اور مومنؔ کے ساتھ ساتھ غالبؔ کو بھی ان شعراء میں شمار کر لیا ہے جن کا تذکرہ اس انتخاب میں پایا جاتا ہے حالانکہ ایسی بات نہیں ہے کیوں کہ اس میں غالبؔ کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ صہبائیؔ نے آخر غالبؔ کو کیوں ناقابل اعتناء سمجھا جبکہ انہوں نے بارہا اپنے اشعار میں ان کی صلاحیت کا اعتراف کیا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی قابل یقین بات نہیں کہی جا سکتی ہے۔ البتہ قیاس چاہتا ہے کہ صہبائیؔ، غالبؔ کی اردو شاعری کو قابل توجہ نہیں سمجھتے ہوں کیونکہ خود غالبؔ نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ میری رنگارنگ فارسی کو دیکھو میری "بیرنگ اردو" سے قطع نظر کرو۔ اس بنا پر انہوں نے غالبؔ کا تذکرہ اپنے اس انتخاب میں شامل نہیں کیا ہو۔ بعض لوگوں نے اس کو معاصرانہ چشمک اور تعصب پر محمول کیا ہے اور صہبائیؔ کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ مگر یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ویسے بھی اس دور میں غالبؔ تیسرے نمبر پر آتے

تھے اور پہلے اور دوسرے نمبر پر ذوقؔ اور مومنؔ کو جگہ دی جاتی تھی۔ چنانچہ عبدالقادر چیف نے جب اپنا روزنامچہ مرتب کیا تو اس میں بھی غالبؔ کو نظر انداز کر دیا اور دہلی میں مومنؔ کو اس عہد کا نمائندہ شاعر مانا ہے (۳۷)۔" اسی طرح شیفتہؔ نے بھی اپنے تذکرہ "گلشن بے خار" میں صہبائیؔ کا ذکر نہیں کیا ہے جبکہ دونوں کے درمیان گہرے مراسم تھے تاہم غالبؔ کی عدم شمولیت اور مول چند کی موجودگی ایک اہم سوالیہ نشان چھوڑ جاتی ہے۔

صہبائی نے نثری تراجم پر زیادہ دھیان نہیں دیا ہے بلکہ انتخابات پر انہوں نے خصوصی توجہ دی ہے جس سے صہبائی کا نظریہ شعر اور مذاق شعر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے بہت ہی دلکش اور خوبصورت اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ اس تذکرہ کی خصوصیت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

"اشعار کا انتخاب پاکیزہ اور مؤلف کے ذوق سلیم پر دلالت کرتا ہے ولیؔ سے لیکر معاصرین تک کا انتخاب مؤلف نے جانفشانی سے کیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ غزل کے ساتھ دوسرے اصناف سخن پر بھی نظر رکھی ہے چنانچہ تذکروں کی عام روش کے مطابق اس میں صرف غزل کے اشعار نہیں ہیں بلکہ اس صنف کا انتخاب بھی دیا ہے جس میں کوئی خاص شاعر خصوصیت رکھتا ہے۔" (۳۸)

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی جو غالبؔ کو اس تذکرہ میں نظر انداز کئے جانے سے کافی نالاں نظر آتے ہیں اور اس بنا پر انہوں نے اس کو نام نہاد تذکرہ کا نام دیا ہے، نے دو تین پہلوؤں سے اسکی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے:

اول یہ کہ اگر موجودہ درسی نظام میں اس کو جگہ دیں تو ادب کے طالبعلم کے لئے مفید ہوگا۔ دوم یہ کہ انیسویں صدی کے علم و ادب کی کہانی صہبائیؔ کے بغیر نامکمل ہے۔ سوم یہ کہ ان کی دوسری تصانیف یا تالیفات کی حیثیت علوم و فنون کی تشریحات و

توضیحات کی ہے۔ ادب کے دائرہ میں ان کلمات کے ساتھ اسی تصنیف یا تالیف کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ صہبائی کے بعض ذہنی رجحانات کا تجزیہ کرنے میں بھی سہولت ہو گی۔ چہارم یہ کہ ترتیب متن کے محقق کو زمانے کے تعین میں سہولت ہو گی (۳۹)۔"

اولیات انتخاب دواوین

صہبائی کا یہ تذکرہ بعض معاملوں میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے چنانچہ اس کی سب سے پہلی انفرادیت یہ ہے کہ یہ اردو کے شعراء کا پہلا تذکرہ ہے، جس میں کلیات اور دواوین کو سامنے رکھ کر ممتاز شعراء کا کلام انتخاب کیا گیا ہے۔ جس سے اس عہد کا نمایاں انتخاب ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

دوسری انفرادیت یہ ہے کہ صہبائی نے انتخاب کرتے وقت کلیات کی تمام ردیفوں کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا ہے جو ایک نئی بات ہے۔ اب تک کسی تذکرہ نگار نے ایسا نہیں کیا تھا۔ بلکہ اپنے حافظے پر اعتماد کر کے اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ اس سے اس تذکرہ کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔

تیسری انفرادیت اس کتاب کا مقدمہ ہے، جس میں زبان و ادب سے متعلق بحثیں ہیں۔ سوائے گارساں دتاسی کے اب تک کسی نے بھی اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ چونکہ گارساں دتاسی کی کتاب فرانسیسی میں ہے اس لئے اردو زبان میں اس قسم کی بحثیں صہبائی کی دین ہے، جس کو اردو ادب فراموش نہیں کر سکتا۔

چوتھی انفرادیت گیت اور ٹھمری کی شمولیت ہے۔ صہبائی پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے اس صنف سخن کو شامل کیا اور اس کو اردو ادبیات کا ایک حصہ بنا دیا۔

انتخاب دواوین کی سب سے اہم انفرادیت اس کا اردو میں تالیف ہونا ہے حالانکہ اس سے قبل کم و بیش ۳۴ شعرائے اردو کے تذکرے لکھے جا چکے تھے۔ لیکن

ان میں دو تین تذکرے ہی ایسے نظر آتے ہیں جو اردو زبان میں لکھے گئے۔ اردو تذکرہ نویسی کی قدیم روایت یہی تھی کہ اسے فارسی میں لکھا جائے لیکن اس قدیم روایت کو سب سے پہلے مرزا علی خاں لطف نے توڑا۔ ان کے بعد سید حیدر بخش حیدریؔ اور بینی نراین جہاں نے اس روایت کو مزید آگے بڑھایا۔ اس اعتبار سے صہبائیؔ کا "انتخاب دواوین" اردو کا چوتھا تذکرہ ہے جو اردو میں لکھا گیا۔ بظاہر یہ تذکرہ چوتھے نمبر پر آتا ہے لیکن حقیقت میں یہ اول مقام کا مستحق ہے کیونکہ اس سے قبل جتنے بھی تذکرے لکھے گئے وہ یا تو کسی کا ترجمہ ہے یا اس کی حیثیت بیاض کی ہے چنانچہ مرزا علی خاں لطفؔ کا تذکرہ "گلشن ہند" اور سید حیدر بخش حیدریؔ کا "تذکرہ حیدری" دونوں "گلزار ابراہیم" مصنفہ علی ابراہیم خلیلؔ کا اردو ترجمہ ہے۔ اسی طرح بینی نراین جہاں کا "دیوان جہاں" در حقیقت ایک بیاض ہے۔ بر خلاف ان تذکروں کے صہبائی کا تذکرہ نہ تو کسی کا ترجمہ ہے اور نہ وہ بیاض ہے بلکہ یہ ایک طبع زاد تذکرہ ہے جس میں بارہ (۱۲) نمائندہ ممتاز شعراء کے تذکرے بیان کئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہو جاتا ہے جو اردو میں تالیف کیا گیا اور جس نے تذکرے کی حیثیت سے بعد کے اکثر تذکرہ نگاروں کی رہنمائی کی ہے۔

انتخاب دواوین کی تنقیدی و ادبی اہمیت

اردو تذکروں کی ادبی اہمیت اور تنقیدی افادیت کے سلسلے میں ناقدین کے مابین اختلاف ہے۔ بعض کا ماننا ہے کہ ان کی ادبی افادیت اور تنقیدی اہمیت مسلم ہے تو بعض حضرات اس کے مخالف نظر آتے ہیں۔ مخالفین میں پیش پیش پروفیسر کلیم الدین احمد ہیں جو اپنے جارحانہ اور شدت پسندانہ انداز کے لئے مشہور ہیں۔ ان کا فرمان ہے کہ:-

> "اب ادبی دنیا اس قدر آگے بڑھ چکی ہے کہ ہمیں ان تذکروں سے کچھ سیکھنا نہیں ہے" (۴۰)

محمد احسن فاروقی بھی اسی مخالف گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے:۔

"اردو کا یہ سارا ادبی و تنقیدی سرمایہ ردی کاغذوں کا ڈھیر نظر آتا ہے" (۴۱)

یہ صحیح ہے کہ موجودہ مذاق شعری اور نظریہ شاعری کے مقابلے میں قدیم تذکروں کی افادیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ان تذکروں ہی کی بدولت آج اردو اس موجودہ شکل میں دکھائی دیتی ہے ورنہ اردو کی ترقی جس رفتار سے ہوئی اس رفتار سے نہ ہوتی۔

کسی بھی ادبی کارنامے پر تبصرہ اور تنقید کرنے سے قبل ناقدوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس عہد اور ماحول کا مطالعہ کریں جس میں یہ کارنامے وجود میں آئے کیونکہ ہر دور اور ہر زمانہ کا الگ مزاج ہوتا ہے، اس کی الگ خصوصیت ہوتی ہے اور ماحول و حالات کے مطابق ہی شعر و سخن کے مراحل طے ہوتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو وہ زبان بہت دیر تک حالات اور ماحول کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ شاعر اور ادیب زمانہ اور حالات کا پروردہ ہوتا ہے۔ زمانہ اور حالات جس چیز کے طالب ہوتے ہیں اس زمانے کے شاعر اور ادیب اسی کمی کو پوری کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ زمانے اور حالات کے تناظر ہی میں اس کو دیکھا جائے جب ایسا ہوگا اس وقت اس دور کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے آئے گی اور تب اس کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔

انتخاب دواوین کے نثری تراجم گرچہ مختصر ہیں لیکن چند کام کی باتیں بھی اس سے دستیاب ہو جاتی ہیں اور یہی اس کی افادیت کو بڑھا دیتی ہے۔ عبادت بریلوی نے "نکات الشعراء" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"نکات الشعرا" کے اندر سختی سے کسی ایسی چیز کی تلاش کرنا جو ادبی، فنی یا تنقیدی نقطہ نظر سے مکمل ہو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ

انفرادی، ذاتی اور شخصی حیثیت کے حامل ہونے کے باوجود کس حد تک ان میں غیر شعوری طور پر وہ عناصر پیدا ہوگئے ہیں جن کو ادبی، فنی یا تنقیدی اہمیت حاصل ہے"۔ (۴۲)

چنانچہ یہی بات "انتخاب دواوین" کے سلسلے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان میں تنقیدی جھلکیاں ضرور ملتی ہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ تذکرہ خالص تنقیدی کتاب نہ بن سکا۔ پھر بھی اس میں ہمیں اس دور کی تنقید کا ایک معیار دیکھنے کو مل جاتا ہے اور اس دور کے تنقیدی نظریات کا ایک ہلکا سا خاکہ ضرور ذہن میں مرتب ہو جاتا ہے۔ اس دور کے حالات و واقعات اور ادبی ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے اس تذکرہ سے اس سے زیادہ کی مانگ کرنا یا امید رکھنا قطعاً درست نہیں کیونکہ ہر دور کا ادب اپنے زمانہ کا سچا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہر دور کی چند اپنی منفرد خصوصیات اور اقدار ہوا کرتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تذکرے ایک خاص مقصد سے لکھے جاتے ہیں وہ نہ تو خالص تاریخیں ہیں اور نہ خالص تنقیدی کتابیں۔ اس دور کے تذکرہ نگاروں کے ذہن میں شاعری کا ایک خاص معیار تھا۔ ان کے مخصوص نظریات تھے۔ انہوں نے شاعری کو اچھی طرح سمجھا تھا اور اپنے تذکرے میں جو کچھ لکھا تھا وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھا تھا۔ یہ واقعی اہم ہے کہ اپنی ان رایوں کے ذریعہ، جو انہوں نے شعراء کے کلام پر دی ہیں، انہوں نے ہم کو اپنے ناقدانہ ذہن اور شعور کے اچھے ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔ چنانچہ اس بات سے انکار ممکن نہیں اردو تنقید کے ارتقا اور تاریخ کے باب میں ان تذکروں کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوگا کیونکہ وہ اس دور کی یادگار ہیں جبکہ آج کی طرح تنقیدی و تاریخی نظریات نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اس وقت کچھ نہیں تھا صرف یہی تذکرے تھے جو تنقیدی، تاریخی اور سوانحی ضرورت کو پورا کرتے تھے اور جب ان تذکروں سے استفادہ کر کے نئی نئی صنعتوں کا اضافہ ہو گیا تو ان کو بے کار سمجھ کر الگ کرنا، اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ اسی تناظر میں

"انتخاب دواوین" کو دیکھنا چاہیے۔

صہبائی کی تنقیدی رائیں گرچہ بلند پایہ نہیں ہیں پھر بھی شعراء کے سوانحی حالات اور تعارف کیلئے کافی ہیں۔ چونکہ صہبائی کا اصل مقصود اس تالیف سے دواوین کا انتخاب کرنا ہے نہ کہ شعراء کے مفصل سوانحی حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ کرنا۔ اس لئے انہوں نے اس پر کوئی خاص محنت نہیں کی ہے البتہ اگر وہ تھوڑی سی ہی محنت کر لیتے تو آج ان کا یہ کارنامہ سب سے وقیع اور اہم ہوتا لیکن یہ بھی درست ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ شعراء کے تعارف کیلئے کافی ہے چنانچہ ولی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شمس ولی اللہ گجراتی کہ نہایت مشہور شعراء دکھن سے ہے اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ عہد عالمگیر اورنگ کے میں وارد دہلی ہو اور شاہ والا جاہ نے اسکی قدردانی کرکے پرورش فرمائی، یہ شخص اول شعراء دکھن سے ہے کہ جس نے زبان دکھنی میں ایک دیوان لکھا کہ قابل مطالعہ کے ہے اور بعض کا مذہب یہ بھی ہے کہ زبان اردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے"۔ (۴۳)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صہبائی نے شعراء کے حالات اور سوانحی کوائف کے بارے میں زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر اعتماد کیا ہے اور ان کی صحت و عدم صحت کے متعلق زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ ولی کے متعلق یہ کہنا کہ عالمگیر اورنگ زیب نے اسکی قدردانی کر پرورش فرمائی، تاریخی اعتبار سے محل نظر ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"اب تک ولی کے کسی تذکرہ نگار نے یہ نہیں لکھا کہ ولی کے دہلی آنے پر اورنگ زیب نے ان کی سرپرستی فرمائی یا ان کو دربار میں باریاب کیا ہے۔ معلوم نہیں کہ صہبائی کا ماخذ کیا ہے۔" (۴۴)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی بھی یہی رائے ہے کہ:

"جس زمانہ میں ولی دہلی آئے عالمگیر خود دکن میں تھا اور دہلی میں ولی
کے ساتھ بادشاہ کا ازراہ قدردانی و پرورش کوئی حسن سلوک ایک بے بنیاد
بات ہے۔" (۴۵)

لیکن محض اس بنا پر کہ ولی کے کسی تذکرہ نگار نے اس قسم کی باتیں نہیں لکھی ہیں، صہبائی کی باتوں کو رد کرنا مناسب نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے پیش نظر کوئی ایسا ماٰخذ ہو جس کو بنیاد بنا کر صہبائی نے لکھا ہو۔ اگر صہبائی اپنا ماٰخذ لکھ دیتے تو آج اردو دنیا ایک نئی تحقیق سے روشناس ہو جاتی چونکہ اکثر تذکرے صہبائی کی تائید نہیں کرتے اس لئے اس کو محل نظر ہی مانا جائے گا۔

اسی ولی کے بارے میں صہبائی کا یہ کہنا کہ "زبان اردو میں شعر کہنا اسی شخص نے اختراع کیا ہے"۔ اس کو بھی محققین قابل اعتبار نہیں سمجھتے جبکہ خود آزاد نے بھی "آب حیات" میں ولی کو اردو شاعری کا "باوا آدم" کہا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر صدیقی صہبائی کی اس تحقیق کو محل نظر مانتے ہیں۔ لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بالاستیعاب اس انتخاب کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ یہ صہبائی کا قول نہیں ہے بلکہ انہوں نے بعض محققین کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے اور دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ صہبائی نے اپنے مقدمہ میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ ولی کے اشعار میں چند شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ مقدمہ کی عبارت ہے:

"اور بعضے کہتے ہیں کہ اردو میں پہلے شعر گوئی ولی نے اختیار کی ہے...
اور ولی نے اپنے اشعار میں اور شعراء پر طنز کی ہے۔" (۴۶)

گویا خود صہبائی اس بات کے قائل ہیں کہ ولی اردو کا اولین شاعر نہیں ہے اس لئے ڈاکٹر ظہیر صدیقی کا تبصرہ حقیقت سے پرے معلوم ہوتا ہے۔

درد کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے صہبائی لکھتے ہیں کہ:

"مذہب ان کا صوفی تھا۔ علم موسیقی اور فن شاعری میں بہت اچھی

قدرت رکھتے تھے"۔(۴۷)

درؔد کے متعلق صہبائی کا یہ تبصرہ دردؔ کی شاعری کے پورے خدوخال کو ظاہر نہیں کرتا ہے ایک عام سی معلومات انہوں نے فراہم کی ہے جس کا تنقیدی بصیرت سے کوئی رشتہ نہیں ہے البتہ سوانحی کوائف سے دردؔ کے معاشرتی ماحول کی تھوڑی بہت عکاسی ہو جاتی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ صہبائی نے دردؔ کا سال وفات بھی رقم کیا ہے جبکہ ولیؔ کے سال وفات کے بارے میں یہ تذکرہ خاموش نظر آتا ہے۔

سوداؔ کے بارے میں صہبائیؔ کی رائے یہ ہے کہ:

"شعر اس کا خوب ہوتا تھا مگر باب مدح اور قدح میں اس کے سامنے انوری کی عقل کا چراغ بھی گل تھا۔ اس کا نام ہی دلالت کرتا ہے اس بات کی تصدیق پر کہ کالے کے روبرو چراغ نہیں جلتا طبیعت اس کے کلام سے بہت خوش ہوتی ہے۔ الغرض کہ استاذ مسلم الثبوت تھا(۴۸)۔"

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ صہبائیؔ نے سوداؔ کو بحیثیت قصیدہ نگار پیش کیا ہے لیکن بطور نمونہ جو اشعار پیش کیے ہیں، وہ غزل کے ہیں حالانکہ سب واقف ہیں کہ سودا کی عظمت قصیدہ نگاری کی وجہ سے ہے غزل گوئی سے نہیں۔

میر تقی میرؔ کے متعلق لکھا ہے کہ:

"اس کی تعریف میں زبان انسان کی عاجز ہے، ریختہ گوئی اور محاورات میں شاعر بے بدل بلکہ شاعر نہ تھا ساحر تھا"

یہ محض تعریفی کلمات ہیں تنقید سے اس کا دور کا بھی رشتہ نظر نہیں آتا ہے۔

جرأت کے بارے میں صہبائیؔ کے ارشادات یہ ہیں:

"...... مصحفی اور انشاء اللہ خاں سے مقابلہ کیا کرتا تھا...... اکثر اشعار ان معاملات کے کہتا جو کہ درمیان عاشق و معشوق کے ہوتے ہیں"۔(۴۹)

میرؔ حسن کی شاعری کے بارے میں صہبائیؔ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔ ذیل

میں باقی شعراء پر صہبائی کے تنقیدی فرمودات نقل کیے جاتے ہیں:

نصیر

"اپنے تئیں مرزا محمد رفیع سودا اور میر محمد تقی پر فائق سمجھے تھے بہر کیف ریختہ گوئی میں دست قدرت اچھی رکھتے تھے"۔ (۵۰)

ممنون

"اس کے کلام کی طرز نہایت دلچسپ اور شیریں ہے غرض کہ گلشن فصاحت کا بلبل ہزار داستاں اور چمن بلاغت کا طوطی شکر فشاں ہے۔" (۵۱)

ناسخ

"الغرض کہ ناسخ، ناسخ تھا شعراء سلف کا"۔ (۵۲)

مول چند

"اکثر قصص شاہنامہ کے زبان ریختہ میں لکھے ہیں" (۵۳)

ذوق

"اب اس زمانہ میں خصوصاً دہلی میں کوئی ان کے مقابلہ کا نہیں اکثر مشاعروں میں اسکی آتش زبانی کے آگے اور شعراء مثل خس و خاشاک کے جلتے ہیں اور اس کے الفاظ برجستہ کے رشک سے جبکہ وہ محفل مشاعرہ میں غزل پڑھتا ہے شرمندہ ہو کر بے تابانہ کف افسوس ملتے ہیں۔" (۵۴)

مومن

"فن شاعری میں مشاہیر دہلی سے ہیں۔" (۵۵)

مذکورہ بالا صہبائی کے تنقیدی فرمودات سے واضح ہوتا ہے کہ عام طور پر صہبائی کی تنقیدیں سرسری اور سطحی ہیں جن کی مدد سے شاعر کا پورا پورا خاکہ بھی نہیں کھینچا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کے

مصداق ان کے نظریۂ اخلاق میں یہ بات ناروا تھی کہ بزرگوں کے عیوب اور کمزوریاں چن چن کر ظاہر کی جائیں۔ اس لئے انہوں نے صرف تعریفی کلمات پر اکتفا کیا ہے۔ نیز اس زمانہ میں تنقید کا معیار آج کی طرح نہیں تھا چنانچہ اس میں بھی وہی روش دکھائی دیتی ہے جو عام تذکروں میں برقرار رکھی گئی تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ کی توقع کرنا مناسب نہ ہوگا۔

انتخاب دواوین کی خامیاں اور کمزوریاں

اس انتخاب میں بعض خامیاں اور کمزوریاں در آئی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) صہبائی نے اپنے دیباچہ میں اردو شاعری کی بحث کے ذیل میں زیادہ تر مثالیں مومنؔ کے کلام سے دی ہیں جو ایک طرح سے اس کو محدود کرتا ہے۔

(۲) اصناف سخن کی تعریف بہت زیادہ واضح نہیں ہے۔ اکثر جگہ ابہام پیدا ہو گیا ہے۔

(۳) اصناف سخن میں مرثیہ، معما اور تضمین سے بالکل گریز کیا گیا ہے۔

(۴) مثنوی میں مستعمل بحروں کا ذکر تو ہوا ہے لیکن نام بتانے سے گریز کیا گیا ہے۔

(۵) سوداؔ کے بارے میں صہبائی کا یہ کہنا کہ ''وہ ایام جوانی میں لکھنؤ کو گیا'' قابل غور ہے۔

(۶) میرؔ کے حالات میں ''نواب سراج الدین علی خاں'' لکھا گیا ہے جبکہ آرزوؔ نواب خاندان سے نہیں تھے۔

(۷) ولیؔ کے بارے میں آج تک کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اورنگ زیب نے قدر دانی فرما کر اس کی پرورش کی۔

(۸) سوداؔ کے انتخاب میں قصیدہ کے بجائے غزل کا انتخاب کیا گیا ہے جبکہ سوداؔ کی عظمت قصیدہ نگاری کی وجہ سے ہے۔

(۹) اسی طرح ذوق کی قصیدہ نگاری کو ترک کر کے اس کی غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

(۱۰) غالب کی عدم شمولیت اس تذکرہ کو شک وشبہہ کے دائرہ میں لا کھڑا کرتی ہے۔

(۱۱) اس دور کے ممتاز و فائق شعراء کو چھوڑ کر مول چند کا تذکرہ شامل کرنا بھی اسکے عیوب میں آتے ہیں۔

اس کے علاوہ صہبائی کی تنقیدی رائیں بھی سرسری اور سطحی ہیں۔ نیز شعرا کا مقام متعین کرنے میں بھی ان سے فروگذاشتیں ہوئی ہیں۔ تاہم ان خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اس انتخاب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ کیوں کہ انیسویں صدی ہجری کے علم و ادب کی داستان صہبائی کے بغیر نامکمل ہی رہے گی۔ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> "صہبائی کے اس تذکرے یا انتخاب کو اردو تذکروں کے طویل سلسلے میں ایک قابل ذکر اضافہ تو نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن ان کے اپنے مذاق اور معیاروں کے مطالعے کے ضمن میں اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور یہ امر تو بہر حال مسلم ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول کی دلی کی علمی اور ادبی شخصیتوں میں ان کا مقام مسلم ہے اور یہ مجموعہ اگر چہ ان کے کمالات علمی کی پوری نمائندگی نہیں کرتا لیکن اس عہد کے علمی و ادبی معیاروں کے مطالعے کے لئے ایک کار آمد دستاویز ضرور ہے"۔(۵۶)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی بھی یہی رائے ہے:

> "ان فروعی کوتاہیوں کے باوصف اس انتخاب کی اپنی تاریخی وادبی اہمیت ہے اور صہبائی کے زمانے کے بعض اہل ادب نے اس سے نمایاں طور پر استفادہ کیا ہے۔"(۵۷)

صہبائیؔ کے مآخذ و مراجع

صہبائی نے اپنے دیباچہ میں کہیں بھی اس کا اشارہ نہیں کیا ہے کہ اس تالیف کے وقت انہوں نے کن ماخذ، اور مراجع سے استفادہ کیا ہے حالانکہ اس کی تالیف کے وقت تک تقریباً ۳۴ تذکرے شعراے اردو کے مرتب ہو چکے تھے۔ گمان غالب ہے کہ صہبائی اس سے ناواقف نہ رہے ہوں گے۔ لیکن یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اتنا طے ہے کہ انہوں نے شعرا کے دواوین کو سامنے رکھ کر اشعار کا انتخاب کیا تھا۔ اس لئے یہ ضرور ہے کہ جن شاعروں کو انہوں نے اپنے اس انتخاب میں شامل کیا ہے، ان کے دواوین سے استفادہ کیا ہو۔ خود صہبائی کی عبارتیں ہمارے اس قول کی تائید کرتی ہیں۔ انہوں نے اکثر شعرا کے حالات میں اخیر میں لکھا ہے کہ:

"یہ چند اشعار ان کے دیوان سے بطور یادگار کے انتخاب ہوئے"۔

اس اعتبار سے دیوان خواجہ میر دردؔ، دیوان سوداؔ، دیوان میر تقیؔ، دیوان جرأتؔ، مثنوی سحر البیان، دیوان ممنونؔ، دیوان ناسخؔ، شاہنامہ مولچند اور دیوان مومنؔ تو ان کے مآخذ تھے ہی البتہ ولیؔ، نصیرؔ اور ذوقؔ کے اشعار کو انہوں نے مختلف کتابوں سے اخذ کیا تھا۔ ولیؔ کے بارے میں تو انہوں نے کوئی نشاندہی نہیں کی ہے۔ لیکن نصیرؔ اور ذوقؔ کے سلسلے میں اس کا اشارہ ملتا ہے۔ نصیرؔ کے حالات کے ذیل میں صہبائی لکھتے ہیں:

"یہ چند اشعار بطور یادگار تذکرہ مصنفہ حکیم فاضل وافضل اعنی میر قدرت اللہ مرحوم تخلص قاسمؔ سے اور اور جاے سے لیے گیے ہیں۔"

(ص ۲۴۸)

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر قدرت اللہ قاسمؔ کا تذکرہ بھی صہبائی کے مآخذ میں تھا۔ "اور اور جاے سے لیے گیے ہیں۔" سے ثابت ہوتا ہے کہ نصیرؔ کے اشعار

کے انتخاب میں مختلف کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ اسی طرح ذوقؔ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"یہ چند اشعار جو ایک بیاض میں تھے بطریق یادگار لکھے جاتے ہیں"

(ص ۳۲۲)

یعنی صہبائی نے ذوقؔ کے اشعار اس مذکورہ بالا بیاض سے حاصل کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کی نشاندہی نہیں کی کہ اس بیاض کے مالک کون تھے اور اس کے مرتب کون۔؟ اس کے علاوہ صہبائیؔ کا ترجمہ کیا ہوا "ترجمہ حدائق البلاغت" بھی یقینی طور پر ان کے مأخذ میں تھا۔ خود انہوں نے دیباچہ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

الغرض صہبائی نے مختلف تذکروں، دواوین اور دیگر کتابوں سے استفادہ کر اس تذکرہ کی تالیف کی ہے۔

انتخاب دواوین بطور مأخذ

میرؔ کے "نکات الشعرا" مرقومہ ۱۱۶۵ھ سے لے کر محمد حسین آزاد کے "آب حیات" مؤلفہ ۱۸۸۰ء تک لگ بھگ شعرائے اردو کے ۶۸ تذکرے لکھے گئے۔ جن میں ۳۴ تذکرے "انتخاب دواوین" سے قبل اور ۳۳ اس کے بعد مرتب ہوئے۔ اس لحاظ سے صہبائی کا تذکرہ درمیانی سلسلے کی کڑی ہے، جو ایک رہنما اور دربان کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

چنانچہ ہم "انتخاب دواوین" کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ترتیب و تالیف میں ضرور ان تذکروں سے مدد لی گئی ہے جو قبلاً تالیف ہو چکے تھے۔ اسی طرح ان تذکروں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے، جو بعد میں لکھے گئے، کہ کسی نہ کسی طور پر ان تذکرہ نگاروں نے "انتخاب دواوین" سے استفادہ کیا ہے اور اس نے تذکرے کی حیثیت سے بعد کے اکثر تذکرہ نگاروں کی رہنمائی کی ہے۔ بعد کے تذکروں میں کریم الدین کے "گلدستہ نازنیناں" اور "طبقات شعرائے الہند"، صابرؔ کے "گلستان سخن"

اور صفا کے ''شمیم سخن'' میں زبان وادب سے متعلق جو مباحث ملتے ہیں، اس پر کسی نہ کسی شکل میں صہبائی کا اثر ہے۔

الغرض ''انتخاب دواوین'' اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوصف اپنے عہد کا ایک اہم علمی وادبی ماخذ اور قابل قدر دستاویز ہے، جس کے بغیر اردو ادب کی تاریخ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔

حواشی

۱۔ طبقات الشعرا (مقدمہ)
۲۔ گلشن ہند (مقدمہ) ص ۴
۳۔ اردو شعرا کے تذکرے
۴۔ تذکرہ میر حسن ص ۱۷۳
۵۔ مجموعہ نغز ۱/ ۲۹۸،۲۵
۶۔ نکات الشعرا ص ۶
۷۔ طبقات الشعرا ص ۴۱۲
۸۔ خطبات ص ۹۴
۹۔ انتخاب دواوین (حرف آغاز) ۷۔۸
۱۰۔ مسالک ومنازل ص ۳۳۳
۱۱۔ انتخاب دواوین (حرف آغاز) ۷۔۸
۱۲۔ ایضاً ص ۲۳
۱۳۔ خطبات ص ۹۴
۱۴۔ رسالہ تذکرات ص ۳۷
۱۵۔ شعرا کے تذکرے ص ۶۲
۱۶۔ انتخاب دواوین ص ۱۹
۱۷۔ ایضاً ص ۴۹
۱۸۔ شعرا کے تذکرے
۱۹۔ اردو شعرا کے تذکرے
۲۰۔ انتخاب دواوین ص ۴۹
۲۱۔ ایضاً ص ۵۰
۲۲۔ ایضاً ص ۵۱۔ ۵۲
۲۳۔ ایضاً ص ۵۲
۲۴۔ ایضاً ص ۵۲
۲۵۔ ایضاً ص ۵۴
۲۶۔ ایضاً ص ۵۴
۲۷۔ ایضاً ص ۵۵
۲۸۔ ایضاً ص ۵۵۔۵۶
۲۹۔ ایضاً ص ۵۶
۳۰۔ ایضاً ص ۵۹

۳۱۔ ایضاً ص ۵۹

۳۲۔ ایضاً ص ۶۰

۳۳۔ ایضاً ص ۶۰۔۶۱

۳۴۔ شعرا کے تذکرے ص ۱۳

۳۵۔ انتخاب دواوین ص ۱۸

۳۶۔ اردو شعرا کے تذکرے ص ۳۱۵

۳۷۔ انتخاب دواوین ص ۳۸

۳۸۔ اردو شعرا کے تذکرے ۳۱۳۔۳۱۷

۳۹۔ انتخاب دواوین ص ۴۵۔۴۶

۴۰۔ اردو تنقید پر ایک نظر ص ۲۱

۴۱۔ اردو میں تنقید ص ۱۵

۴۲۔ اردو تنقید کا ارتقا ص ۸۲

۴۳۔ انتخاب دواوین ص ۸۰

۴۴۔ ایضاً ص ۴۰

۴۵۔ ایضاً ص ۲۰

۴۶۔ ایضاً ص ۲۰

۴۷۔ ایضاً ص ۹۶

۴۸۔ ایضاً ص ۱۳۰

۴۹۔ ایضاً ص ۲۰۰

۵۰۔ ایضاً ص ۲۴۸

۵۱۔ ایضاً ص ۲۶۴

۵۲۔ ایضاً ص ۲۸۶

۵۳۔ ایضاً ص ۳۱۰

۵۴۔ ایضاً ص ۳۲۲

۵۵۔ ایضاً ص ۳۴۹

۵۶۔ ایضاً ص ۴۷

۵۷۔ ایضاً ص ۲۴

صہبائی بحیثیت قواعد نگار / لغت نویس

ہر زبان کے کچھ نہ کچھ قواعد و ضوابط ہوتے ہیں، جسے اپنا کر وہ ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہے اور جو زبان کی صفائی، اصلاح اور نکھار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ نیز انہیں کی بدولت زبان ہمہ دم تازہ اور شگفتہ رہتی ہے اور یہی اس کے زندہ و تابندہ ہونے کی دلیل بھی ہوتے ہیں۔ آج تک جتنی بھی زبانیں پیدا ہوئیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی اصول و ضوابط ان کی ترقی میں معاون و مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ انہیں اصول و ضوابط کو قواعد اور گرامر کا نام دیا گیا ہے۔

اردو زبان جو لشکر شاہجہانی کی بدولت وجود میں آئی، وہ کیوں کر اس سے احتراز کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس زبان کے قواعد پر بھی بہت ساری کتابیں لکھی گئیں۔ اردو زبان وادب کی تاریخ کی ورق گردانی کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں قواعد کے بجائے سب سے پہلے اردو لغت پر خامہ فرسائی کی گئی۔ گریرسن نے اپنی کتاب ''لنگویسٹک سروے آف انڈیا'' کی نویں جلد میں، جس میں ہندستانی زبان کے لغات اور قواعد کا جائزہ لیا گیا ہے، لکھا ہے کہ ان کے پاس ایک قلمی مسودہ تھا جو فارسی، ہندستانی، انگریزی اور پرتگالی الفاظ کے لغات پر مشتمل تھا اور جس کی تالیف ۱۶۳۰ء میں بمقام سورت ہوئی تھی۔ اس میں ہندستانی الفاظ کے لیے رومن اور گجراتی رسم خط استعمال کیا گیا ہے۔

ہندستانی زبان کے قواعد سے متعلق سب سے پہلی کتاب John Joshua Ketelaer کی ہے۔ یہ لاطینی زبان میں لکھی گئی تھی۔ مولوی عبدالحق نے اس کا زمانۂ تالیف ۱۷۱۵ء بتایا ہے (۱)۔ اس کے بعد انگریزی اور اردو میں قواعد کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ مولوی عبدالحق اور محمد عتیق صدیقی (۲) نے اپنی کتابوں میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

”رسالہ قواعد صرف و نحو اردو“ صہبائی کی تیسری اردو تصنیف ہے۔ اس سے قبل وہ ”ترجمہ حدایق البلاغت“ اور ”انتخاب دواوین“ کی ذمہ داریوں سے بحسن و خوبی عہدہ برا ہو چکے تھے اور ان دونوں کتابوں کی عام مقبولیت اور شہرت نے جہاں صہبائی کی حوصلہ افزائی کی، وہیں پرنسپل بوترو بھی اس سے کافی خوش ہوئے اور ان کی علمی لیاقت اور اردو زباندانی کے اور بھی معترف ہوگئے۔ حالانکہ صہبائی ”آتش پارسی“ کے ہندستانی پجاریوں میں سب سے اونچے مرتبے پر فائز تھے۔ یہ تو پرنسپل بوترو کی متنوع الصفات ذات تھی، جس کی نظر عنایت اور نگہ التفات نے اس ”آتش پارسی“ کو اردو بھگت بننے پر مجبور کر دیا۔ اور ایسے شخص سے، جس کا اوڑھنا بچھونا فارسی ہو، اردو کتابیں لکھوانا کم کمال کی بات نہیں ہے۔

”رسالہ قواعد صرف و نحو اردو“ بھی سابقہ دونوں کتابوں کی طرح پرنسپل بوترو کی فرمائش پر تالیف لکھا گیا۔ صہبائی اپنے دیباچہ میں اس کے سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”تحصیل اکثر کتب علمیہ کی کہ زمانۂ سابق میں زبان یونانی سے مترجم ہو کر عبارت عربی کے زیور سے محلی ہوئیں بغیر صرف اور نحو کے مشکل تھی۔ اسی واسطے اکثروں پر ان علوم کا حاصل کرنا دشوار تھا۔ علمانے سہولت پر نظر کر کے اکثر کتب صرف و نحو بلکہ بعضے رسالہ منطق اور بہت کتابیں علم وغیرہ کی زبان فارسی میں ترجمہ کیں اور اس کا فائدہ یہاں تک عام ہوا کہ ہر کوئی تھوڑی سی فارسی پڑھ کر ان علموں کی ہوس کرنے لگا خصوصاً علم طب کہ اگر بعض اطبائے حال سے مسئلہ شرح اسباب اور نفیسی اور قانون کا پوچھو تو جواب سوال کیا بلکہ شاید وہ عبارت بھی کبھی ان کے گوش زد نہ ہوئی ہوگی۔ اور ترجمہ فارسی کی تحصیل سے علاج معالجہ ان کا بہت خاصہ ہے۔ بلکہ اکثر ایسے ہیں کہ ان کے معالجہ پر باوجود کمی استعداد علم کے کوئی

انگشت اعتراض نہیں رکھ سکتا۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ ازبس زبان فارسی اہل ہند کی زبان سے غیر ہے۔ اگر وہ علوم زبان اردو میں ترجمہ کیے جاتے تو تحصیل ان کی زبان کی حیثیت سے بہت سہل ہو جاتی۔ اسی واسطے بالفعل اکثر صاحبان عالیشان کو اس امر کی طرف بہت توجہ ہے خصوصاً صاحب والا مناقب بلند مراتب منصب دوراں نوشیرواں زمان بوٹرس صاحب بہادر پرنسپل مدرسہ اور ان کی سعی سے اکثر کتب زبان انگریزی اور بعض زبان عربی اور چند نسخہ سیَر اور تاریخ کی زبان فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ اور الحق کہ حدایق البلاغت، شمس الدین فقیر کی کہ عبارت اس کی فارسی ہے۔ طالب علموں کے سوا کوئی اس کو ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور جب سے اس احقر نے بموجب فرمایش صاحب ممدوح کے اردو میں ترجمہ کیا اکثر کم استعدادوں نے جن کو فن شعر سے مناسبت تھی اس کو بہم پہونچا کر کچھ کچھ فائدہ اٹھایا اور یہاں تک ہمت ان کی اسی امر میں مصروف ہے کہ اس زبان کے صاف ہونے کے واسطے مدرسہ انگریزی میں بیشتر لوگوں کو اردو کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور ازبسکہ قواعد کی تحصیل میں زیادہ تر فائدہ ہوتا ہے۔ اس احقر سے ارشاد کیا کہ اردو کی صرف اور نحو کے قواعد میں ایک رسالہ تالیف کرے تاکہ اس سے فائدہ تام اور منفعت عام حاصل ہو اور اس کے اخیر میں بطریق اختصار کے چند لغت اور اصطلاح اور محاورہ زبان اردو کے اور مثالیں جو اکثر زبان زد ہیں، بھی مندرج کرے۔ اس واسطے احقر نے اس رسالہ کو ایک مقدمہ اور چار باب پر مرتب کیا۔"(۳)

اس کا پہلا ایڈیشن بقول گارساں دتاسی ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں سید محمد خاں مالک سید الاخبار کے چھاپے خانے سے شائع ہوا تھا(۴)۔ البتہ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے

کہ ۱۸۴۹ء میں طبع ہوا(۵) لیکن یہ درست نہیں ہے۔ بلکہ ۱۸۴۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا۔ اولین ایڈیشن کے سرورق کے اندراجات حسب ذیل تھے:

رسالہ قواعد اردو

مشتمل اوپر چار باب کے

باب اول علم صرف، باب دوم علم نحو، باب سویم لغت زبان اردو، باب چہارم اردو مثلوں کے بیان میں تصنیف کیا ہوا مولوی امام بخش مدرس اول مدرسہ فارسی کا۔

جناب محمد خاں بہادر کے چھاپے خانے کے لیتھوگرافک پریس میں تیسری مئی ۱۸۴۵ء سید عبدالغفور کے اہتمام سے چھپا۔

اور انگریزی میں کتاب اور مصنف کا نام یوں درج تھا:

A GRAMMAR OF THE URDU LANGUAGE IN URDU

BY

MOULVI IMAM BUX OF THE DELHI COLLEGE

اور اس کا دوسرا ایڈیشن چار برس بعد ۱۸۴۹ء میں باہتمام سید اشرف علی مطبع العلوم واقع کشمیری دروازہ میں شائع ہوا۔ پھر ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں اس کا ایک اور ایڈیشن نولکشور لکھنؤ سے نکلا اور یہی نسخہ ہمارے پیش نظر ہے۔ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان کوئی ایڈیشن نکلا یا نہیں، اس کے بارے میں سردست کوئی اطلاع نہیں ہے۔ اور جو نسخہ ہماری دسترس میں ہے، وہ ناقص الاوسط ہے۔ اس میں ص ۶۹-۷۲ اور ۱۰۱-۱۰۵ نہیں ہے۔

صہبائی نے اس رسالہ کو ایک مقدمہ اور چار ابواب پر منقسم کیا ہے:

مقدمہ- زبان اردو کی تحقیق میں اور جو اس سے متعلق ہے (ص ۴)

باب پہلا- علم صرف میں (ص ۱۲)

باب دوسرا- علم نحو کے بیان میں (ص ۴۲)

باب تیسرا- لغت میں

باب چوتھا- امثال میں

مقدمہ میں اردو زبان کے آغاز وارتقا، اس کے تغیر و تبدل اور صوتیات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ اردو کے آغاز سے متعلق آج تک جتنی بھی تحقیقات سامنے آئی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک یہ متحقق نہ ہو سکا کہ اردو کہاں پیدا ہوئی! محققین و نقادان فن مختلف مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کوئی دلی، کوئی سندھ، کوئی بنگال، کوئی اور مقامات غرض کہ جتنے علاقے ہیں، سب میں اردو کی پیدائش بتائی جاتی ہے۔ جو جس علاقے اور خطہ سے تعلق رکھتا ہے، وہ اسی کو اردو کی جائے پیدایش بتاتا ہے۔ اور لوگوں کی طرح صہبائی بھی دلی کو ہی اس کی جائے پیدائش مانتے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں فارسی کی مثال بھی پیش کی ہے کہ جس طرح فارسی دربار جمشیدی کے طفیل وجود میں آئی۔ اسی طرح اردو بھی لشکر شاہجہانی کے ذریعہ۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”زبان اردو ہندوستان کی زبانوں میں مثل زبان دری کے ہے۔ فارسی زبانوں میں ہر چند دری کے معنی میں اختلاف اقوال کا بہت ہے۔ لیکن جو محقق ہے وہ یہ ہے کہ دری مرکب ہے لفظ ”در“ اور یاے نسبت سے اور در بمعنی دربار کے ہے پس دری کے معنی یہ ہیں کہ منسوب دربار کے ساتھ اور دربار سے جمشید کا دربار مراد ہے یعنی یہ زبان جمشید کے دربار کے حاضر ہونے والوں کی زبان ہے۔ اور محل خاص میں اس زبان کے علحدہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ ازبسکہ اطراف کے لوگ وہاں جمع ہوتے تھے، ان سب کی زبان کے الفاظ مخلوط ہو کر ایک زبان جداگانہ حاصل ہو گئی۔ اسی طرح زبان اردو اور یہ لفظ فارسی بمعنی لشکر کے۔ ظاہراً لشکر سے اس جاے میں مراد لشکر شاہجہاں بادشاہ ہے۔ کس واسطے کہ اردو شاہجہاں آباد کے مجتمع تھے۔

ان سب کی زبان مل کر یہ زبان حاصل ہوئی اور اس کو زبان اردو کہتے تھے۔
بعد مدت کے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کا نام اردو ہو گیا۔ اسی
واسطے اس زبان میں الفاظ عربی اور فارسی بلکہ سنسکرت کے بھی پائے جاتے
ہیں۔" (۶)

صہبائیؔ کا انداز اور طرز تکلم بتاتا ہے کہ اس وقت یہ محقق تھا کہ اردو شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئی۔ ورنہ صہبائیؔ اپنی سابقہ روایت کے مطابق اس طرف ضرور اشارہ کرتے کہ اردو کی جائے پیدائش شاہجہاں آباد کے بارے میں اقوال مختلف ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اردو مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی اس مقام پر پہنچی ہے اور دیگر زبانوں کی مانند اس میں بھی تغیر و تبدل کارفرما رہا ہے۔ اس سلسلے میں صہبائی لکھتے ہیں:

"زبان ہر زمانے میں متغیر اور متبدل ہوتی رہتی ہے اس وضع سے کہ
جو محاورہ اور الفاظ کہ متقدمین اس کو استعمال کرتے تھے۔ متاخرین بنا بر
زیادتی امتیاز کے یا کسی اور وجہ سے اس کو مکروہ جان کر متروک کر دیتے
ہیں۔ چنانچہ ... متقدمین کے اشعار سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ جو الفاظ
آبروؔ اور ولیؔ کے اشعار میں مستعمل ہوئے ہیں، سوداؔ کے اشعار میں نہیں
پائے جاتے۔ بعضے ان الفاظ اور محاوروں میں ایسے ہیں کہ از بس وہ الفاظ
متروک ہوگئے ہیں۔ ہم کو ان کے معنی پر ہرگز اطلاع نہیں۔ اور یہ بعینہٖ
ان الفاظ فارسی کی مانند ہے کہ خاقانیؔ اور عسجدیؔ اور عنصریؔ اور فردوسیؔ
وغیرہم کے کلام میں مستعمل ہیں اور جب تک فرہنگوں کو مطالعہ نہیں
کرتے۔ ان کے معنی نہیں معلوم ہوتے" (ص ۵)

صہبائی نے اپنے مقدمہ میں اس حقیقت کو بھی واشگاف کیا ہے کہ زبان تغیر و تبدل کے مرحلے سے گزرنے کے بعد جب ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے تو اس وقت

کی زبان اگلے وقتوں سے کافی متفاوت ہو جاتی ہے۔ اور اس کی تراش و خراش بھی کافی نمایاں ہو جاتی ہے۔ صہبائی کی عبارت ہے:

"اور اس زمانے کی نسبت اس زمانہ کی زبان نے ایسی تراش پائی ہے کہ مافوق اس سے متصور نہیں اور اس کلام سے جو ادائے مطلب کے واسطے آپس میں فصحا استعمال کرتے ہیں شعر کی زبان بمراتب افصح ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ معنی عقلا پر واضح ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ شعرا فصاحت کے پایہ میں ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔ چنانچہ غزل گوئی میں میرؔ تقی علیہ الرحمۃ بہ نسبت سوداؔ کے فصاحت زیادہ رکھتا ہے۔ گو سوداؔ بھی شاعری میں مسلم الثبوت ہے۔" (ص ٦)

صہبائیؔ اہل زبان کے مستعملات کو کافی اہمیت دیتے تھے ان کا ماننا ہے کہ کسی بھی زبان کے معاملے میں اہل زبان ہی مستند ہوتے ہیں۔ اس میں کسی قیاس کا دخل قطعاً جائز نہیں:

"جو لفظ اہل زبان کے کلام میں جس طرح مستعمل ہوا ہے، اسی طرح استعمال کرے اور قیاس کو دخل نہ دے وگرنہ استعمال اس کا غلط ہو جائے گا مثلاً اردو میں حقہ پینا بولتے ہیں اور فارسی میں قلیان کشیدن اگر بلحاظ فارسی کے حقہ کھینچنا کہیں یا بلحاظ اردو کے قلیان نوشیدن۔ اہل فہم اس پر ہنسیں گے اور کلام اس کا خالی خبط سے نہ ہوگا اور اسی طرح سے مرکب کی اجزا کو ترکیب کی قیاس پر علحدہ استعمال کرنا جب تک کہ مفرد برأسہ مستعمل نہ ہو۔ اگر غلط نہ ہوگا فصاحت کے واسطے ضرور مضر ہوگا۔ مثلاً اسی لفظ "بھلے مانس" کے اجزا کو خصوصاً "مانس" کو کہ گواروں کی زبان کے سوا اور کوئی نہیں بولتا۔" (ص ٦-٧)

اس حد تک تو بات درست اور صحیح تھی۔ لیکن ان کا کہنا کہ اہل زبان میں

شاہجہاں آباد ہی کی زبان مستند ہے۔ باعث اختلاف ہے۔ کیوں کہ اس سے اردو زبان ایک علاقہ اور ایک مقام تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شاہجہاں آباد کے علاوہ ایسے بہت سے مقامات ہیں، جن کی زبان کو قابل استناد مانا جا سکتا ہے اور مانا جاتا بھی ہے۔ چنانچہ دبستان دلی کے علاوہ دبستان لکھنؤ، دبستان عظیم آباد وغیرہ۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر علاقے اور ہر خطے کا اپنا ایک ماحول اور مزاج ہوتا ہے اور الگ رنگ بھی۔ انہیں کے مطابق الفاظ بنتے بھی ہیں اور ڈھلتے بھی ہیں۔ اگر نہیں تو کیا ضروری ہے کہ فقط شاہجہاں آباد کی اردو کو تسلیم کیا جائے اور باقی کو رد کر دیا جائے۔ آج جب کہ "بہار اردو لغت" کو لوگ ماننے لگے ہیں لہذا اس قسم کی باتوں میں اب کوئی وزن نہیں رہ گیا ہے۔ چونکہ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ لہذا اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ صہبائی کی تحریر نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

> "...اور استعمال میں بھی اس زبان پر اعتماد کرے جس کو فصحا نے زیادہ استعمال کیا ہو اور وہ زبان ہندوستان میں حضرت شاہجہاں آباد صانہا اللہ عن الآفات والفساد کی ہے اور زبان اردو اور دیار کی اس کی فرع ہے۔ چنانچہ یہ مشہور ہے کہ از بس انقلاب دہری سے لوگوں پر تنگی معاش نے ہجوم کیا۔ یہاں کے رہنے والے علی الخصوص شعرائے بلیغ مثل میر تقی اور سودا کہ ان کی اصل یہی خاک پاک ہے، اطراف کو نکل گئے اور ان کی بود و باش کی طفیل سے وہاں کی زبان نے ایک تراش نو پیدا کی۔ اور وہاں کے لوگوں نے انہیں غفران پناہوں کے کلام کے تتبع سے ایک پایہ فصاحت کا حاصل کیا اور از بسکہ اہل زبان اور تتبع میں باوجود سعی وافر کے فرق اور تفاوت رہتا ہے۔ اب تک بھی اس سواد کی زبان باوجود اس طرح کی تراش اور اصلاح کی بہ نسبت شاہجہاں آباد کی زبان کے تکلف سے خالی نہیں معلوم ہوتی۔ پس

اگر ایک محاورہ کسی اور شہر کے شعرا کے کلام میں ہو اور اس پر روز مرہ اہل شاہجہاں کا مساعدت نہ کرے۔ اس کے استعمال میں ہنوز کلام ہے باعتبار فصاحت کے نہ باعتبار غلط و صحت کے۔" (ص ۷)

یہ بڑی مضحکہ خیز بات انہوں نے لکھی ہے کہ میر تقی میر اور سودا کے وہ شاگرد جنہوں نے ان سے شاہجہاں آباد سے باہر کسب فیوض کیا۔ وہ کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہوں، اگر شاہجہاں آباد کے روزمرے ان کے محاورات کی مساعدت نہ کرے تو وہ فصیح نہیں ہو سکتے۔ کسی بھی زبان کو پرکھنے اور جانچنے کا قطعاً یہ کوئی پیمانہ اور معیار نہیں ہو سکتا۔ یہ علاقائیت سے متاثر باتیں تو ہو سکتی ہیں، محققہ اور تسلیم شدہ بالکل نہیں۔

ان مباحث کے علاوہ صہبائی نے مقدمہ میں ایک بحث اور چھیڑی ہے اور وہ ہے آوازوں کا تغیر و تبدل۔ یعنی آوازوں کے متغیر ہونے سے جملوں کے معنی میں کافی فرق آجاتا ہے۔ کبھی ان آوازوں سے استفہام مراد ہوتا ہے تو کبھی اخبار۔ اس بحث کو انہوں نے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے اور توقف کی علامتیں بھی ظاہر کی ہیں۔

اس تفصیلی گفتگو کے بعد صہبائی اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے پہلے باب کو علم صرف کے مباحث کے لئے مختص کیا ہے، جس میں مندرجہ ذیل چار فصلیں ہیں:

پہلی فصل: صرف کے معنی و مطالب پر روشنی ڈالی گئی ہے (ص ۱۲)

دوسری فصل: مصدر کے بیان میں (ص ۱۴)

تیسری فصل: مصدر کے اقسام کے بیان میں (ص ۱۷)

چوتھی فصل: متعدی کے بیان میں (ص ۲۰)۔ اس کو دس انواع میں منقسم کیا گیا ہے:

پہلی نوع: فعل ماضی کے بیان میں (ص ۲۰)۔ اور یہ کئی اصناف پر محتوی ہے۔

پہلی صنف: ماضی مطلق کے بیان میں (ص ۲۰)

دوسری صنف: ماضی قریب کے بیان میں (ص ۲۵)

تیسری صنف: ماضی بعید کے بیان میں (ص ۲۵)

چوتھی صنف: ماضی استمراری کے بیان میں (ص ۲۶)

دوسری نوع: مضارع کی بحث میں (۲۹)

تیسری نوع: امر کی بحث میں (ص ۳۴)

چوتھی نوع: نہی کی بحث میں (ص ۳۴)

پانچویں نوع: اسم فاعل کی بحث میں (۳۵)

چھٹی نوع: اسم مفعول کی بحث میں (ص ۳۵)

ساتویں نوع: اسم آلہ کی بحث میں (ص ۳۶)

آٹھویں نوع: اسم تفضیل میں (ص ۳۶)

نویں نوع: صفت مشبہ میں (ص ۳۷)

دسویں نوع: ظرف کے بیان میں (ص ۳۷)

اس کتاب کے دوسرے باب میں علم نحو کے مباحث زیر تحریر لائے گئے ہیں۔ ابتدا میں علم نحو اور اسم، فعل اور حرف کی علامتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر تین ابواب میں ان مباحث کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا باب: اسم کی بحث میں (ص ۴۶) اور اس کی کئی فصلیں کی گئی ہیں:

پہلی فصل: اسم اور اس کی قسمیں (ص ۴۶)

قسم اول: علم (ص ۴۶)، قسم دوم: ضمیر (ص ۴۸)

قسم سوم: اسم اشارہ (ص ۵۱)، قسم چہارم: اسماء موصولہ (ص ۵۱)

قسم پنجم: اسماء اصوات (ص ۵۲)، قسم ششم: اسماء ظروف (ص ۵۲)

قسم ہفتم: اسماء کنایہ (ص ۵۶)

دوسری فصل: اقسام اسم باعتبار نکرہ و معرفہ (ص ۵۶)

تیسری فصل: اقسام اسم باعتبار مذکر و مؤنث (ص ۵۷)

آٹھویں فصل: اس عطف کے بیان میں جو بواسطہ حروف عاطفہ کے ہو (ص ۹۶)

نویں فصل: عطف کے بیان میں (۹۶)

ان قواعد کے مجموعی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی نے بھی عام اردو قواعد نگاروں کی مانند فارسی قواعد کے نمونوں اور اصطلاحوں کو پیش نظر رکھا ہے، جس کی بنیاد خود ایک حد تک عربی صرف و نحو پر تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی آریائی مزاج کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اردو کی ابتدا کے بارے میں تحقیقات بالکل ابتدائی مدارج میں تھی۔ اور اردوئے قدیم کا بہت بڑا حصہ عام طور پر مؤلفین اور مصنفین کی دسترس سے باہر تھا۔ نیز اردو اور دیگر ہندستانی زبانوں اور بولیوں کے تقابلی مطالعہ کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ ان کے سامنے دو ہی مستند اور معیاری نمونے تھے۔ ایک تو دلّی کی اردوئے معلّیٰ اور دوسری لکھنؤ کی اردو۔

چونکہ یہ اردو کی نشو و نما کا ایک اہم عبوری دور تھا۔ اس لئے ان قواعد نویسوں کے مابین ایک اور رجحان مشترک طور پر پایا جاتا ہے، وہ شعرا کے کلام سے سند دینے کا رواج ہے۔ اور دہلی میں اردو کا جو محاورہ ارتقاپذیر ہوا تھا وہی اس زبان کا معتبر اور مستند محاورہ قرار پایا تھا۔ اس لئے اکثر اشعار ان شعرا کے شامل ہیں، جو دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ صہبائی تو اس معاملہ میں اور سخت تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی اس رواج کو بھرپور اپنایا ہے۔ بطور نمونہ چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

''ہووے گا'' اور ''ہوئے گا'' کی فصاحت اور عدم فصاحت پر روشنی ڈالتے ہوئے صہبائی لکھتے ہیں:

> ''ہووے گا'' زیادہ تر فصاحت رکھتا ہے اور ''ہوئے گا'' کم۔ اگرچہ شعر میں شیخ ابراہیم ذوق سلمہ اللہ تعالیٰ کے جو راقم کے الطاف گستران شفیق میں سے ہے. بندھا ہوا ہے

ہوئے گا کشتی طوفان زدہ تابوت اپنا

آگیا اپنے اگر مرنے پہ رونا ہم کو(ص ۳۰)

اور ایک جگہ ''آئے ہے'' اور ''آوے ہے'' کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں

''اگرچہ عوام شاہجہاں آباد کی ان الفاظ کو اکثر محاورے میں بھی استعمال کرتے ہیں لیکن فصحا یہاں کے کم بولتے ہیں اور اگر ان کے کلام میں پایا جاتا ہے تو بر سبیل شاذ جیسے اس شعر میں شیخ ابراہیم ذوق سلمہٗ اللہ تعالیٰ کے۔

بیت ؎

واہ رے شور محبت خوب ہے جھڑکا نمک

استخواں میری ہماں کس کس مزہ سے کھائے ہے(ص ۳۱)

صہبائی نے نہ صرف شعرا کے کلام سے سند پیش کیا ہے بلکہ اس کی تشریح و توضیح کرتے گئے ہیں اور جہاں کہیں کسی شاعر کا کلام قواعد کے برخلاف نظر آیا اس کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات بھی واضح کر دیے ہیں۔ چنانچہ لفظ ''تاثیر'' کی تذکیر و تانیث کی بحث میں لکھتے ہیں:

''لفظ تاثیر کا زمانہ حال کے روزمرہ میں موافق قاعدہ ہی کے مستعمل ہے (یعنی حروف تہجی میں ۲۱ حروف مؤنث مستعمل ہیں اور ان میں ایک ''ت'' بھی ہے)۔ الاّ اس شعر میں سوداؔ کے مذکر بندھا ہے ؎

سالہا ہم نے صنم نالۂ شبگیر کیا

آہ ایک روز تیرے دل میں نہ تاثیر کیا

شاید سابق کی زبان میں مستعمل ہو اور اگر کہا جاوے کہ ضرورت شعری سے ہے۔ یہ بات نہایت مہمل ہے کس واسطے کہ یہ امر دال ہے کمال عجز پر اور عاجز کا کلام قابل اسناد کے نہیں ہوتا اور اگر کہا جاوے کہ یہاں لفظ ''کو'' مقدر ہے یعنی ایک روز نہ تاثیر کو کیا تو اس صورت میں لفظ

"کیا" کا لانا درست ہو جاوے گا جیسے روٹی کہ بسبب تانیث کے کھائی کہتے ہیں اور اگر لفظ "کو" کو زیادہ کر دیں اور کہیں "روٹی کو کھایا" تو لفظ "کھایا" کہ علامت تذکیر کی رکھتا ہے، لانا درست ہو گا۔ پس اس کا جواب یہ کہ "روٹی کھائی" اور "روٹی کو کھایا" محاورہ میں دونوں مستعمل ہیں اور "تاثیر کو کیا" نہیں بولتے ہیں اگرچہ قاعدہ کی رو سے درست ہو جاوے۔" (ص ٦٠)

اسی طرح فاعل کی تقدیم و تاخیر کے باب میں تحریر فرماتے ہیں:

"فاعل کبھی فعل سے پہلے مذکور ہوتا ہے۔۔۔ اور کبھی بعد فعل سے۔۔۔ لیکن فاعل کا پہلے فعل سے مذکور کرنا فصیح ہے بہ نسبت بعد مذکور کرنے کے اور یہ فصاحت اور عدم فصاحت باعتبار آپس میں بولنے کے ہے۔ لیکن شعر میں قسم دوسری بھی غیر فصیح نہیں معلوم ہوتی۔ مثال قسم اول شعر غالبؔ۔۔۔۔ کا

دوست غمخواری میں مرے سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

یعنی فرمانے کا فاعل "دوست" اور "بڑھ جانے" کا فاعل "ناخن" ہے کہ فعل پر مقدم ہے۔ اور یہ شعر میرؔ کا ہے۔

ابر اوٹھا جو کعبہ سے سو جھوم پڑا میخانہ پر
بادہ کشوں کی جھرمٹ ہے اب شیشہ اور پیمانہ پر

"ابر" فاعل ہے "اوٹھا" کا اور فعل پر مقدم ہے۔ اور مثال قسم دوسری کی شعر سوداؔ کا ہے

کہتا ہے واعظ کہ نے سنیے تو یہ منع ہے
کہنے ہی کی بات ہے اس کو سنا کیجئے

"واعظ" فاعل ہے اور فعل یعنی "کہتا ہے" سے مؤخر ہے اور جیسے اس

شعر آزردہ میں ؎

ہوتا ہے درد سینہ میں اوٹھتی ہے ہوک سی
آزردہ جاں ہے دل ہے حزیں تیرے واسطے

"درد" فاعل ہے "ہوتا ہے" کا اور "ہوک" فاعل ہے "اوٹھتی ہے" کا
کہ اپنے افعال سے مؤخر ہیں"۔ (ص ۶۴-۶۵)

بعض قواعد نویسوں کی مانند صہبائی نے بھی اپنی اس کتاب میں لغت اور امثال کو بھی شامل کیا ہے۔ حالانکہ ان کا تعلق قواعد سے بہت کم ہے۔ جیسا کہ قبلاً ذکر ہوا کہ قواعد کے برخلاف اردو لغت پر پہلے توجہ دی گئی۔ چنانچہ سب سے پہلا اردو لغت ۱۶۳۰ء میں بمقام سورت لکھا گیا۔ اس کے بعد بہت سارے لغات مرتب کیے گیے۔ البتہ اردو مصطلحات و محاورات کے لحاظ سے بقول عندلیب شادانی "مرزا جان طپش" کی "شمس البیان فی مصطلحات الھندوستان" (۱۲۰۸ھ) اردو کی پہلی فرہنگ ہے، جس میں مصطلحات و محاورات سے بحث کی گئی ہے اور ہر محاورہ کی مثال کلام اساتذہ سے پیش کی گئی ہے۔ شمس البیان کے بعد تقریباً نصف صدی کے دوران اردو لغت کی متعدد کتابیں لکھی گئیں مثلاً: ۱۔ مفتاح اللغات عرف نام مالا (۱۲۳۶ھ)، ۲۔ دلیل ساطع از واصف (۱۲۴۸ھ)، ۳۔ نفائس اللغات از اوحدالدین بلگرامی (۱۲۵۳ھ)، نفس اللغۃ از رشک (۱۲۵۶ھ)۔ لیکن یہ چاروں کتابیں عام لغات سے بحث کرتی ہیں، مصطلحات و محاورات کے لیے مخصوص نہیں۔ نفائس اللغات اور نفس اللغۃ میں مفرد الفاظ کے ساتھ ساتھ بعض محاورات بھی ملتے ہیں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ محاورات کی تعداد بہت قلیل ہے، ان کی سند میں کلام اساتذہ سے شواہد و نظائر نہیں پیش کیے گیے ہیں۔ شمس البیان کے چودہ سال بعد یعنی ۱۲۲۲ھ میں انشا نے "دریائے لطافت" لکھی، جس کے دردانہ چہارم میں مصطلحات دہلی سے اور دردانہ پنجم میں مصطلحات زنان دہلی سے بحث کی ہے، لیکن سند میں اساتذہ کے اشعار نقل نہیں کیے۔ شمس البیان کے ۵۲ سال

بعد یعنی ۱۲۶۱ھ میں نیاز علی بیگ نکہت دہلوی نے "مخزن فوائد" تالیف کی۔ اس کتاب کا موضوع مصطلحات زبان اردو ہے اور شمس البیان کے بعد یہ دوسری کتاب ہے، جو اس موضوع پر لکھی گئی۔ (۷)

یہاں فاضل مضمون نگار سے ایک اہم ماخذ چھوٹ گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو صہبائی کے "رسالہ قواعد صرف و نحو اردو" کا علم ہی نہ تھا۔ اگر ہوگا بھی تو ان کی رسائی اس قواعد تک نہ ہو سکی ہوگی۔ کیوں کہ یہ رسالہ صرف قواعد ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں اردو مصطلحات، محاورات اور ضرب الامثال کے مباحث بھی شامل ہیں۔ اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ "مخزن فوائد" مؤلفہ نکہت سے قبل کی تالیف کردہ ہے۔ "مخزن فوائد" کا سال تصنیف اور طباعت ۱۲۶۱ھ / جولائی ۱۸۴۵ء ہے (۸)۔ جب کہ صہبائی کے اس رسالے کا زمانہ اشاعت ۱۲۶۱ھ / تیسری مئی ۱۸۴۵ء ہے (۹)۔ اس لیے زمانی ترتیب میں انشا کے بعد صہبائی کا نام آنا چاہیے نہ کہ نکہت کا۔ یہ الگ بات ہے کہ نکہت کی کتاب "مخزن فوائد" کافی ضخیم ہے اور شعرا کے کلام سے شواہد و نظائر بھی کافی پیش کیے گیے ہیں تاہم صہبائی کی یہ کاوش بھی کم اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ اگرچہ وہ شواہد میں زیادہ اشعار نہیں پیش کر سکے ہیں البتہ جہاں ان کو بآسانی دستیاب ہوگئے ہیں، انہوں نے درج کر دیا ہے۔ دو چار نمونے ملاحظہ ہوں:

> ابر قبلہ: وہ ابر جو قبلہ سے اوٹھے اور یہ ابر اغلب کہ خوب برستا ہے ہر چند قبلہ اور کعبہ ایک ہے لیکن فارسی میں اس ابر کو ابر قبلہ کہتے ہیں نہ ابر کعبہ مگر میر تقی نے ابر کو کعبہ کی طرف ایک شعر میں منسوب کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اوس شعر میں لفظ کعبہ کا بہ نسبت قبلہ خوب گرم واقع ہوا ہے۔
>
> ابر اوٹھا جو کعبہ سے سو جھوم پڑا میخانہ پر
> بادہ کشوں کی جھرمٹ ہے اب شیشہ اور پیانہ پر (ص ۹۸)
>
> باغ سبز دکھانا: فریب دینا۔ انشاء اللہ خاں کا شعر

گل داغ و خندۂ زخم سے پڑے اور سیکڑوں آبلے

مجھے باغ سبز دکھائے ہے الم فراق میں باغ دل (ص ۱۰۵)

پلیتھن نکالنا: کسی کو اس طرح سے زدو وکوب کرنا کہ بیدم ہو جاوے۔ سوداؔ کا شعر:

نکے مسرف کے گھر لگاؤں گا

اور پلیتھن ترا نکالوں گا (ص ۱۱۵)

جان پر کھیلنا: محل ہلاک میں اپنے تئیں ڈالنا۔ دردؔ کا شعر:

جان پہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا

جی نہ رہے یا رہے مجکو ادھر دیکھنا (ص ۱۳۵)

چوم چاٹ کر چھوڑ دینا: عبارت اس سے ہے کہ جب کوئی چیز اپنے قابو سے اور تصرف سے باہر ہو اس کو بوسہ دیں اور بعد اوس کے اوس سے ہاتھ اٹھاویں۔ انشاء اللہ خاں کا شعر:

ہلکے پھلکے جو ملے دیر کے روڑے پتھر

چوم اور چاٹ کے میں کعبہ کے چھوڑے پتھر (ص ۱۴۱)

شیطان: ابلیس اور بمعنی معنوی کے، مجازاً۔ انشاء اللہ خاں کا شعر:

کس گلی میں وہ رہے ہے ہے کہاں کا وہ خبیث

کوئی شیطان ہوئے گا جس نے کہ ذکر ایسا کیا (ص ۱۶۵)

گرم: حار اور غضبناک اور چسپاں اور اختلاط۔ انشاء اللہ خاں کا شعر:

صد شکر خدا جذب محبت کی بدولت

کچھ آج وہ خلطہ میں بہت مجھ سے رہا گرم (ص ۱۸۹)

وصال: ملاقات اور مجازاً بمعنی موت کے بھی مستعمل ہے جیسے اس شعر مشہور میں:

لوگ مرنے کو بھی کہتے ہیں وصال
یہ اگر سچ ہے تو مرجاتے ہیں ہم (ص ۲۱۱)

ہاتھاپائی: جنگ مشت ولکد باہم اور کبھی اس لکد و مشت پر، جو ایک جانب سے ہو، بھی اطلاق کرتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں کا شعر:

ہاتھا پائی ہوئی کچھ ایسی کہ پھر
اون کی اونگلی کی چڑھ گئی چٹ نس (ص ۳۱۲)

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ ضرب الامثال، مصطلحات اور محاورات اردو صہبائی کے لئے ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے بھرپور کوشش کی ہے۔ اس لیے ہر حال میں اس کو مخزن فوائد کے مقابلے میں اولیت حاصل ہے۔

صہبائی اور نکہت ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن دونوں کے مابین بعض معاملوں میں کافی مغایرت پائی جاتی ہے اور بعض میں کافی مماثلت۔ مماثلت یہ ہے کہ ان دونوں کی کتابیں مسٹر بوترو کی فرمائش سے لکھی گئیں۔ نکہت اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"یہ چند اصطلاحیں اور محاورے اور مثلیں ہندی کی، ساتھ اسناد اشعار شعرائے عالی تبار کے صفحہ قرطاس پر حسب ارشاد۔ مسٹر فلکس بوترس صاحب بہادر پرنسپل مدارس دہلی کے، تحریر پذیر ہوئیں۔" (۱۰)

اور صہبائی کی عبارت یہ ہے:

"صاحب والا مناقب بلند مراتب منصف دوراں، نوشیرواں زمان بوترس صاحب بہادر پرنسپل ... (نے) اس احقر سے ارشاد کیا کہ اردو کی صرف ونحو کے قواعد میں ایک رسالہ تالیف کرے۔" (۱۱)

چونکہ یہ دونوں ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانے کی کتابیں ہیں۔ اس لیے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ہر ایک کو ان کتابوں کا علم رہا ہوگا۔ لیکن دونوں نے کہیں بھی اس کا اشارہ نہیں کیا ہے۔

ان دونوں میں مغایرت یہ ہے کہ نکہتؔ نے اگرچہ اپنی فرہنگ میں الفاظ کی تین قسمیں کی ہیں یعنی اصطلاح، محاورہ اور مثل، لیکن انہوں نے کسی مسلمہ اصول کو نہیں اپنایا ہے بلکہ اپنی صواب دید پر بعض کو محاورہ اور بعض کو مثل اور اصطلاح قرار دیا ہے۔ جب کہ بر خلاف اس کے صہباؔئی نے کوئی قسم نہیں کی ہے بلکہ لغت اور مثل کے تحت سارے الفاظ کے معانی درج کیے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ نکہتؔ نے اپنی فرہنگ میں فاعل جمع مؤنث ہونے کی صورت میں صفات نیز افعال کے ہر دو اجزا کو بصیغۂ جمع استعمال کیا ہے۔ مثلاً ''سوکن اور سوت'' کے معنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوکن اور سوت یعنی ایک مرد کی دو جورواں وہ آپس میں سوتیں یا سوکنیں کہلاتیاں ہیں۔'' (۱۲)

جب کہ ایک ہی عہد، ایک زمانہ اور ایک ہی مقام میں ہونے کے باوجود صہباؔئی کے یہاں یہ استعمال نہیں ملتا ہے۔ مثلاً:

''سوکن: جب دو عورتیں کسی کے نکاح میں ہوں ایک دوسری کی سوکن ہوتی ہے'' (۱۳)

اس کے علاوہ نکہتؔ کے مقابلے صہباؔئی کی زبان زیادہ صاف اور سادہ ہے۔ ویسے تو نکہتؔ کی زبان میں بھی سادگی اور صفائی پائی جاتی ہے لیکن زمانے کے موافق بعض مقامات پر انہوں نے پر تکلف عبارتیں بھی تحریر کی ہیں۔ مثلاً

''کالے تل چابے ہیں: دستور ہے کہ جو کوئی غلام یا لونڈی خرید کرتا ہے تو واسطے نیک شگون کے کالے تل چبواتے ہیں تاکہ وفادار ہو اور رقم بے وفائی قلم بے مروتی سے لوح نافرمانی پر یک قلم رقم نہ کرے۔'' (۱۴)

اس کے بر عکس صہباؔئی کی زبان میں تصنع اور تکلف نہیں پایا جاتا جب کہ وہ اپنے زمانے کے بیدلؔ اور ظہورؔی تھے اور ان کی فارسی کتابیں بیدلؔ اور ظہورؔی کی یاد دلاتی ہیں لیکن ان کی اردو کتابیں اس پیچیدگی سے خالی ہے۔

صہبائی نے اپنے کسی مأخذ کا ذکر نہیں کیا ہے، جس وقت یہ کتاب لکھی گئی، اس وقت تک اردو قواعد اور اردو لغت کی متعدد کتابیں مرتب ہو چکی تھیں، جس کا ذکر راقم الحروف نے اس باب کی ابتدا میں کیا ہے۔ اس لیے یہ ضرور ہے کہ انہوں نے ضرور کسی نہ کسی مأخذ سے استفادہ کیا ہوگا۔ قواعد کی بحث میں انہوں نے اگرچہ اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے البتہ لغت کے بیان میں انہوں نے چند مقامات پر عبدالواسع کے رسالہ لغات ہندی کا حوالہ دیا ہے (۱۵)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ان کے مأخذ میں تھا نیز اس کے علاوہ بھی دیگر مراجع ضرور رہے ہوں گے۔ لیکن ان کی نشاندہی کرنا امر مشکل ہے۔

اگرچہ صہبائی سے قبل اردو قواعد اور لغت پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی تھیں۔ لیکن ان سب میں صہبائی کا امتیاز اور ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی زبان نسبتاً واضح، صاف اور مدلل ہے۔ اور خصوصی توجہ کا باعث تیسرا اور چوتھا باب ہے، جس میں انہوں نے روزمرہ، محاورات اور ضرب الامثال کو قدرے تفصیل و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس رسالہ کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے گارساں دتاسی لکھتے ہیں:

> "ان کی قواعد اردو اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل قدر ہے کہ اس کے آخر میں ضرب الامثال اور محاورات کی ایک فہرست درج ہے۔" (۱۶)

اور مولوی عبدالحق تحریر کرتے ہیں:

> "یہ کتاب بھی اچھی ہے۔ اس کے آخر میں بہ ترتیب حروف ابجدی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں۔" (۱۷)

بابائے اردو اپنی دوسری تصنیف "مرحوم دہلی کالج" میں رقم طراز ہیں:

> "اردو صرف و نحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی، جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں۔" (۱۸)

الغرض یہ کتاب بھی صہبائی کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ جس کے مجموعی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ صہبائی اہل علم اور اہل زبان کی بول چال کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور لوگوں سے اس کی توقع رکھتے تھے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اردو زبان کے معاملے میں ان کا نظریہ بالکل واضح اور صاف تھا۔ "قول فیصل" میں وہ اپنے نظریہ کا اعلان کر چکے تھے کہ:

"ایرانی نژاد اگر صد سال در ہند بگذارند در فصاحت زبان اردو با چہار ساله طفلگی بر نیاید۔" (۱۹)

یعنی اہل ایران اگر سو سال بھی ہندستان جنت نشان میں مقیم رہیں پھر بھی وہ زبان اردو کی فصاحت میں چار سال کے بچہ کے برابر نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کے علاوہ ایک اور "قواعد اردو" صہبائی سے منسوب کی جاتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، گارساں دتاسی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"گارسن خبردار کرتا ہے کہ صہبائی کی قواعد اردو کو ان کی ایک اور تصنیف قاعدہ اردو سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اس آخر الذکر نام سے انہوں نے اردو کی تعلیم و تدریس کے لئے ایک ابتدائی کتاب لکھی تھی۔ جس میں اردو کے حروف تہجی سے بحث کی گئی تھی۔ یہ کتاب صہبائی نے کالج کی ملازمت کے دوران لکھی اور قیاس ہے کہ یہ کالج کے طلبا کی تدریس کے لئے لکھی گئی ہو۔" (۲۰)

چونکہ یہ کتاب اب ناپید ہے۔ اس لیے اس سے متعلق کچھ لکھنا ممکن نہیں۔

اردو تصنیفات میں صہبائی نے جو اسلوب اور طرز اپنایا ہے وہ فارسی نگارشات کے مقابلے میں سلیس، رواں، سہل اور شیریں ہے۔ تعقید لفظی و معنوی پیچیدگی، خیال در خیال اور استعارہ در استعارہ کے اوصاف سے خالی ہیں۔ لگتا ہے کہ جملوں کی ساخت وغیرہ کے معاملوں میں وہ فارسی کی تقلید سے آزاد ہو چکے تھے اور فاعل، مفعول اور

فعل کی ترتیب کے علاوہ مضاف، مضاف الیہ وغیرہ کے لانے میں وہ عموماً اردو کی بول چال اور روزمرہ کی پابندی کرتے تھے۔ ان مذکورہ کتابوں کے اسلوب اور آثار الصنادید کے طرز میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں اسلوبوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اگر یہی زبان وہ اپنی فارسی تصانیف میں اختیار کرتے تو آج غالبؔ اور اقبالؔ کی طرح ان کو بھی پڑھا جاتا۔ مذکورہ بالا مثالوں سے ان کی اسلوب نگارش اور طرز تحریر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ قواعد اردو، مقدمہ
۲۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۵
۳۔ رسالہ قواعد صرف و نحو اردو ص ۲، ۳
۴۔ بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ۸ / ۳۹۶
۵۔ قواعد اردو ص ۱۶
۶۔ رسالہ قواعد صرف و نحو اردو ص ۴
۷۔ معاصر، پٹنہ، حصہ ۵
۸۔ مخزن فوائد، پیش گفتار
۹۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ۸ / ۳۹۶
۱۰۔ مخزن فوائد ص ۱
۱۱۔ رسالہ قواعد صرف و نحو اردو ص ۳
۱۲۔ مخزن فوائد ص ۲۹۳
۱۳۔ رسالہ قواعد صرف و نحو اردو ص ۱۶۲
۱۴۔ مخزن فوائد ص ۳۵۵
۱۵۔ رسالہ قواعد صرف و نحو اردو ص ۱۰۰، ۱۰۵، ۱۳۳، ۱۵۱، ۱۸۵، ۲۱۲
۱۶۔ خطبات ص ۱۶۴
۱۷۔ قواعد اردو ص ۱۶
۱۸۔ مرحوم دہلی کالج ص ۱۴۹
۱۹۔ قول فیصل ص ۴
۲۰۔ جامع القواعد ص ۱۷۶

صہبائی بحیثیت اردو شاعر

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صہبائی فارسی میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔چنانچہ ان کا جو فارسی دیوان متداول ہے ،اس میں ردیف وار ۶۱ غزلیں، ۶ قصائد، ۴ فردیات، ۱۲ رباعیات اور ایک مخمس شوکت بخاری کی غزل پر شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کے بہت سے اشعار ان کی دوسری تصانیف اور ان کے ہم عصروں اور شاگردوں کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں اور اکثر صاحب فضل و دانش نے ان کی فارسی شاعری کی تعریف بھی کی ہے۔غالب جیسا خود بیں بھی ان کی شعری صلاحیت کا معترف تھا۔لیکن اب تک کسی بھی تذکرہ نگار نے صہبائی کو اردو شاعر کے بطور پیش نہیں کیا ہے۔خود ان کے شاگرد رشید مرزا قادر بخش صابر اور رفیق غم گسار سر سید احمد خاں خاموش دکھائی دیتے ہیں۔البتہ مولوی کریم الدین نے دو متضاد باتیں لکھی ہیں۔ایک جگہ تو وہ انکار کرتے ہیں:

> ”کتب عربیہ میں صرف و نحو اور معانی اور منطق بھی جانتے ہیں، مگر بجز فارسی اردو شعر نہیں کہتے۔“(۱)

اور دوسری جگہ بعض اردو اشعار کا اقرار کرتے ہیں:

> ”یہ صاحب بجز فارسی کے اردو شعر نہیں کہتے مگر چند (اشعار) ان کی تصنیف حدائق البلاغت کے ترجمہ میں اردو (کے) ہیں۔“(۲)

مرزا فرحت اللہ بیگ کا بھی یہی خیال ہے کہ صہبائی اردو شعر نہیں کہا کرتے تھے۔وہ لکھتے ہیں:

> ”مولانا صہبائی کی علمیت کا ڈنکا تو تمام ہندستان میں بج رہا ہے۔ایسے جامع الکمالات کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ہزاروں شاگرد ہیں۔اکثر ریختہ کہتے ہیں۔ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں مگر خود ان کا کلام تمام و

کمال فارسی میں ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی ان کی کوئی غزل دیکھی، نہ
سنی اور مشاعرے میں (بھی) فارسی غزل پڑھی۔" (۳)

چنانچہ اکثر حضرات کا خیال یہی ہے کہ صہبائی اردو میں سخن سرا نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ایک ایسا شخص جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر ماہرانہ قدرت رکھتا ہو، دونوں زبانوں کے شاگردوں کو شاعری میں اصلاح دیا کرتا ہو، وہ خود صرف فارسی میں طبع آزمائی کرے اردو میں نہیں۔ یہ عقل سے لگتی ہوئی بات نہیں معلوم ہوتی ہے۔ لہذا اس سلسلے میں خاموشی اختیار کرلینا یا بلا تحقیق و جستجو یہ کہہ کر کہ اردو میں شاعری نہیں کرتے تھے، آگے بڑھ جانا صہبائی کے ساتھ انصاف نہ ہوگا۔ جب کہ اکثر حضرات اس سے متفق ہیں کہ وہ ادبی ذوق بہت اعلیٰ پایے کا رکھتے تھے اور محققین اور ناقدین نے "انتخاب دواوین" میں ان کے مذاق شعری کو سراہا بھی ہے۔ نیز یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "ان کے ہزاروں شاگرد تھے، اکثر ریختہ کہتے تھے۔ ان کو اصلاح دیتے تھے اور خوب دیتے تھے۔" ایسے لائق و فائق تلامذہ کے استاد کیا اردو شاعری سے اپنا دامن بچا پائے ہوں گے؟ اس کا جواب اگر نفی میں نہیں دیا جاسکتا تو اثبات میں بھی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ صہبائی کے اردو اشعار کی عدم دستیابی نے سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ تاہم قطعی طور پر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے "آتش پارسی" کے مقابلے میں اردو شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس لیے باقاعدگی سے اس کو نہیں اپنایا۔ لیکن جب ضرورت محسوس ہوئی تو اس جانب بھی مائل ہوئے۔ چنانچہ "حدائق البلاغت" کا ترجمہ کرتے وقت جب انھیں مثال دینے کے لیے اردو شعر نہیں ملے تو خود کہہ کر اس کمی کو پورا کر دیا۔ خود مولوی کریم الدین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے اس کا اقرار تو کیا کہ "ترجمہ حدائق البلاغت" میں چند اشعار صہبائی کے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس کی نشاندہی نہیں کی کہ کون کون اشعار صہبائی کے ہیں۔ اس سلسلے میں حکیم نجم الغنی خاں پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اپنی

کتاب ''بحر الفصاحت ''میں بعض اردو اشعار کو صہبائی سے منسوب کیا ہے۔انھوں نے جن اشعار کو صہبائی کا طبع زاد گمان کیا ہے۔وہ حسب ذیل ہیں

دیکھنا منہ لال ہو جائیں گے کس کس کے ابھی
سامنے میرے جو برگ سبزِ پان تو نے دیا(۴)

شب کو جشن سرور تخت رہا
کار فیض مدام بخت رہا(۵)

تجھے اور تیرے دشمن کو سدا ہے اوج عالم میں
تجھے تخت خلافت پر اسے دار سیاست پر(۶)

آتش غم ایسی کچھ بھڑکی کہ پل میں ہو گیا
داغ دل سے آفتاب روز محشر آشکار(۷)

زلف اس مہ وش کے رخ پر اک دخاں ہے آگ پر
اور رخ اس مہروش کا شعلہ ہے زیر دخاں
ہائے یوں ہو اس دخاں سے تیرہ اپنا روز عیش
اور اس شعلے سے یوں روشن ہو شام دشمناں(۸)

کہتا ہے کہ اب نہ کھینچ تو آہیں
ہیں دل سے ترے تو ہم تلک راہیں(۹)

بیٹھا وہ رقیب کے جو پہلو میں
اٹھا یہ درد دل کہ کھینچی آہ(۱۰)

مذکورہ بالا آٹھ اشعار کو حکیم صاحب نے صہبائی سے منسوب کیا ہے۔لیکن انھوں نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ ان کا ماٴخذ کیا ہے۔البتہ یہ طے ہے کہ انھوں نے ''بحر الفصاحت ''کی تالیف میں ''ترجمہ حدائق البلاغت '' سے استفادہ کیا ہے۔اس لیے یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ان اشعار کو وہیں سے اقتباس کیا ہے۔کیوں

کہ اسکے علاوہ کوئی دوسرا ماٰخذ دستیاب نہیں ہے، جس میں صہبائی کے اردو اشعار مندرج ہوں۔ اس صورت میں ایک "ترجمہ حدایق البلاغت" ہی تن تنہا صہبائی کی اردو شاعری کا ثبوت ہے، جس کو بطور ماٰخذ اپنا کر حکیم صاحب نے صہبائی کے چند اردو اشعار اپنی کتاب میں درج کیے۔ اب رہا سوال کہ کیا خود صہبائی نے ایسی کوئی بات لکھی ہے یا ایسا کوئی اشارہ دیا ہے، جس کی بنا پر کہا جائے کہ یہ انھیں کے اشعار ہیں۔ اس سلسلے میں صہبائی کے انداز بیان اور طرز کلام کو جاننا از حد ضروری ہو گا۔ چنانچہ ذیل میں ان عبارتوں کو نقل کیا جاتا ہے جہاں جہاں یہ اشعار مذکور ہیں:

"اور مثال اس تذبیح کی کہ بطریق ایہام کے مقصود ہو۔ یہ ہے:

دیکھنا منہ لال ہو جائیں گے کس کس کے ابھی

سامنے میرے جو برگ سبز پان تو نے دیا (ص ٦٨)"

"صنعت خیفا: وہ ہے کہ سارا ایک کلمہ منقوطہ اور ایک سارا کلمہ غیر منقوطہ ہو

شب کو جشن سرور تخت رہا

کار فیض مدام بخت رہا (ص ۹۸)"

"صنعت جمع و تقسیم...... جیسے اس شعر میں ؎

تجھے اور تیرے دشمن کو سدا ہے اوج عالم میں

تجھے تخت خلافت پر اسے دار سیاست پر (ص ٧٦)"

"اور تجرید...... اس کی مثالیں عربی اور فارسی میں بہت ہیں۔ اردو میں یہ شعر مثال ہو سکتا ہے ؎

آتش غم ایسی کچھ بھڑکی کہ پل میں ہو گیا

داغ دل سے آفتاب روز محشر آشکار (ص ۱۲)"

"صنعت تقسیم...... چنانچہ اس قطعہ میں ؎

زلف اس مہ وش کے رخ پر اک دخاں ہے آگ پر
اور رخ اس مہروش کا شعلہ ہے زیر دخاں
ہائے یوں ہو اس دخاں سے تیرہ اپنا روز عیش
اور اس شعلے سے یوں روشن ہو شام دشمناں (ص ۷۵)"

"ہزج مسدس اخرب مقبوض اشتر مسبغ ؎
کہتا ہے کہ اب نہ کھینچ تو آہیں
ہیں دل سے ترے تو ہم تلک راہیں (ص ۱۲۸)"

"......اور کبھی اس وزن میں زحافات بدل بھی جاتے ہیں جیسے اس شعر میں ؎
بیٹھا وہ رقیب کے جو پہلو میں
اٹھا یہ درد دل کہ کھینچی آہ (ص ۱۲۹)"

"ترجمہ حدایق البلاغت" کے مذکورہ بالا ان اقتباسات سے ایسا کچھ اشارہ نہیں ملتا کہ خود صہبائی نے ان اشعار کو اپنا طبع زاد کہا ہو۔ البتہ آتش غم...... والے شعر میں دور کا اشارہ ملتا ہے۔ پھر بھی قطعیت سے نہ تو اقرار کیا جاسکتا ہے اور نہ انکار۔ نیز حکیم صاحب نے بغیر سوچ سمجھے تو ان اشعار کو ان سے نہیں منسوب کر دیا ہے۔ ان کو ضرور ایسے ذرائع فراہم ہوں گے، جن کی بنیاد پر انھوں نے ایسا کیا ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ صہبائی نے اس ترجمہ میں چونکہ اس کا التزام کیا ہے کہ عربی فارسی کی مثالوں کی جگہ اردو مثالیں رقم کریں۔ چنانچہ انھوں نے اس کا بھرپور لحاظ رکھا ہے اور بہت محنت و مشقت سے اردو شعرا کے کلام سے سندیں پیش کی ہیں۔ حتی کہ جہاں ان کو مثالیں دستیاب نہ ہو سکیں وہاں انھوں نے خود شعر کہہ کر اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ البتہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو بغیر شاعر کے نام کے مندرج ہیں۔ ان کی تعداد پونے دو سو کے قریب ہے۔ ان نامعلوم اشعار کے بارے میں دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں:

ایک تو یہ کہ صہبائی کو شاعر کا نام معلوم نہ رہا ہو اور بوجہ لاعلمی نہ لکھا ہو۔ یا معلوم رہا ہو لیکن بوجہ شہرت نہ لکھا ہو۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار کو صہبائی نے بدون اسم شاعر لکھا ہے

چمن میں صبح جب اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آب رواں سے کام لیا(۱۱)

دل نہ کر منت زراہ بیقراری بیشتر
ناز کو کرتی ہے یاں الحاح و زاری بیشتر

کام آیا نہ کچھ اپنا تن زار آخرکار
سمجھے اکسیر تھے نکلا یہ غبار آخرکار(۱۲)

تیرے ہی دیکھنے کو نہ آوے جو کام چشم
تو زخم چہرہ پر ہے کہ اس کا ہے نام چشم(۱۳)

خون جو کیا ہے بے گنہ تو نے مرا دل و جگر
لیتے ہیں تجھ سے حشر میں اپنے یہ انتقام دو(۱۴)

یوں جلوہ گر ہو سرو کا سایہ کہ جس طرح
کوئی سیاہ مست کھڑا ہو کنار جو(۱۵)

بخشتی ہے گل نو رستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھینٹ قلم کا بہر دشت و جبل

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحہ پر طلائی جدول(۱۶)

حالانکہ یہ سارے اشعار سودا کے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ صہبائی کو نہ معلوم ہو اور

یہ بھی ہو سکتا ہے معلوم تو ہو لیکن بوجوہ نام نہ لکھا ہو۔ کیوں کہ ان میں بعض اشعار خود صہبائی کے تذکرہ "انتخاب دواوین" میں سودا کے ترجمے میں مرقوم ہیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ چند اشعار خود صہبائی کے ہوں اور یہ خیال و گمان بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ چند اشعار "ترجمہ حدائق البلاغت" میں ایسے ہیں، جو نا معلوم شاعر کے ہیں۔ انھیں میں وہ آٹھ اشعار ہیں جو حکیم صاحب نے صہبائی سے منسوب کیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور اشعار ہیں جو صہبائی کے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

ہم کو ملا جو لطف کوئے یار کا
کب وہ صبا کو لطف ہے گلزار یار کا (ص ۱۳۰)

نالہ دل نارسا ہے یار تلک
اپنی پہونچ کب ہے گلعذار تلک (ص ۱۳۴)

شکوہ ہے کسی کا نہ ہمیں اے دل
دے بیٹھے جاں اب تو اس کو دے دل (ص ۱۳۵)

یہ عشق اب کیا بسا ہے دل میں
کہ بحر خوں بہہ رہا ہے دل میں (ص ۱۳۹)

بار غم کا اٹھانا ہی پڑا آہ
داغ ہجر کا کھانا ہی پڑا آہ (ص ۱۴۱)

ظلم کا اب اس سے گلہ لطف ہے کیا
جو نہ سنے شکوہ کا کیا فائدہ ہے (ص ۱۳۰)

نہ جانے قصد ہے کس خوں گرفتہ کا کہ رہتی ہے
علم شمشیر زہر آلودہ سر بر چشم فتاں کے (ص ۴۶)

یار بے وفا سے ہمیں شوخ دلربا سے ہمیں
کب امید وصل ہوئی کب امید وصل ہوئی
(ص ۱۳۸)

مذکورہ بالا اشعار ایسے ہیں جنھیں خود حکیم نجم الغنی صاحب نے بغیر شاعر کے حوالے سے لکھا ہے یعنی انھیں بھی اس کا علم نہ تھا کے یہ اشعار کن کے ہیں۔ جب کہ بیشتر مقامات پر انھوں نے پابندی سے شعرا کا نام دیا ہے۔ یہ اگرچہ اس کی تائید میں پیش نہیں کیے جاسکتے کہ انھوں نے ان کو صہبائی کا گمان کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں اس کا شبہ ہو اور عدم تحقیق کی وجہ سے انھوں نے ان آٹھ اشعار میں ان کو شامل نہیں کیا، جن کو انھوں نے صہبائی کے نام سے درج کیا ہے۔ بہر حال اتنا تو طے ہے کہ ان دونوں حضرات نے ایک ہی اصطلاح کی سند میں یہ اشعار پیش کیے ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ''ترجمہ حدایق البلاغت'' حکیم صاحب کے پیش نظر تھا۔ اس لیے قطعیت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اسی ترجمہ سے ان کو اخذ کیا ہے۔ گویا حکیم صاحب کو ان اصطلاحوں کی سند میں اس کے علاوہ دوسرے اشعار نہیں مل سکے ورنہ اپنی سابقہ روایت کے مطابق دوسرے اشعار نقل کرتے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ اشعار خود صہبائی کے ہیں۔ ہمارے اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ صہبائی نے اس ترجمہ کو عام فہم بنانے کے لیے عربی اور فارسی کی جگہ اردو اشعار دینے کا بھرپور التزام کیا ہے اور جہاں جہاں انھیں مثالیں نہ مل سکیں، خود شعر کہہ کر اس کو مزید عام فہم اور جامع بنادیا ہے۔ ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو جائیگی۔ انھوں نے مفاعلن مفتعلن مفاعلن مفتعلن کی بحر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس وزن میں اشعار اردو نہیں دیکھے گئے۔ بہر حال مثال اس کی یہ ہے:

دل و جگر خون ہے مرا

سرشک خون بہتے سدا (ص ۱۳۰)''

صہبائی کا انداز تحریر صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ اشعار ان کے ہی ہیں۔ ورنہ وہ یہ نہیں لکھتے کہ اس وزن میں اشعار نہیں دیکھے گئے۔

ان مباحث سے یہ تحقیق پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ صہبائی اردو میں بھی

شعر کہا کرتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے زیادہ اشعار نہیں کہے یا اگر کہا ہو تو اب تک ہماری دسترس سے باہر ہیں۔

مذکورہ بالا اشعار میں ایک قطعہ کے علاوہ بیشتر غزل کے ہیں۔ایک شعر مثنوی اور ایک قصیدے کے معلوم ہوتے ہیں۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی مروجہ اصناف میں انھوں نے طبع آزمائی کی تھی، جو ان کی مہارت اور قابلیت کا بین ثبوت ہیں البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ انھوں نے کوئی پورا قصیدہ یا مثنوی کہی تھی یا نہیں۔اس بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں ہیں۔

حواشی

۱۔ طبقات الشعراص ۴۱۲
۲۔ گلستان سخن ص ۴۱۲
۳۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ ص ۹۶
۴۔ بحر الفصاحت ص ۱۰۲۳
۵۔ ایضاً ص ۹۷۹
۶۔ ایضاً ص ۱۰۷۳
۷۔ ایضاً ص ۱۰۴۷
۸۔ ایضاً ص ۱۰۶۸
۹۔ ایضاً ص ۱۹۰
۱۰۔ ایضاً
۱۱۔ کلیات سودا ص ۹۱۶
۱۲۔ انتخاب دواوین ص ۱۴۶
۱۳۔ کلیات سودا ص ۳۷۷
۱۴۔ ایضاً ص ۹۱
۱۵۔ ایضاً ص ۱۶۲
۱۶۔ بحر الفصاحت ص ۴۳۷

مصادر و مراجع

تصانیف صہبائی:

۱۔ کلیات صہبائی (جلد اول) / مرتبہ دین دیال۔ کان پور: مطبع نظامی، ۱۸۷۸ء:

۱۔ ریزہ جواہر مع فرہنگ

۲۔ بیاض شوق پیام

۳۔ رسالہ در نحو فارسی

۴۔ دیوان صہبائی

۵۔ کافی در علم قوافی

۶۔ وافی شرح کافی

۷۔ گنجینہ رموز

۸۔ جواہر منظوم

۹۔ قطعہ معمائی

۱۰۔ مخزن اسرار

۱۱۔ رسالہ نادرہ

۱۲۔ نتائج الافکار

۱۳۔ غوامض سخن

۱۴۔ اعلاء الحق

۲۔ کلیات صہبائی (جلد دوم، حصہ اول) / مرتبہ منشی دین دیال۔ لکھنو: نولکشور، ۱۸۷۹ء

۱۔ شرح سہ نثر ظہوری

۲۔ شرح مینا بازار

۳۔ شرح پنج رقعہ

۴۔ شرح شبنم شاداب

۳۔ کلیات صہبائی (جلد دوم، حصہ دوم):

۱۔ شرح حسن و عشق

۲۔ شرح معمای نصیرائی ہمدانی

۳۔ شرح معمای جامی

۴۔ رسالہ مناقشات سخن

۵۔ رسالہ قول فیصل

۶۔ رسالہ قواعد صرف و نحو

۷۔ ترجمہ حدایق البلاغت

۸۔ مخمس بر غزل قدسی و تقریظ دیوان حافظ

۴۔ متفرق کتب جو کلیات میں شامل نہیں ہیں:

۱۔ حل مقامات جواہر الحروف

۲۔ شرح الفاظ مشکلہ ٹیک چند بہار

۳۔ انتخاب دواوین

۴۔ رسالہ تحقیق دوائر

۵۔ شرح جواہر الحروف

۶۔ مثنوی دمغ الباطل

۷۔ رسالہ حرف فارسی

۸۔ دیوان خواجہ میر درد

کتب

۱۔ آب حیات / محمد حسین آزاد۔ دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۸۹۶ء

۲۔ آتش کدہ / لطف علی بیگ آذر۔ بمبئی، ۱۲۷۷ھ

۳۔ آثار الصنادید / سر سید احمد خان۔ لکھنؤ: نو لکشور، ۱۸۹۵ء

۴۔ آئین اکبری / ابو الفضل علامی؛ مرتبہ سر سید احمد خاں۔ لکھنؤ: نو لکشور، ۱۸۹۵ء

۵۔ ۱۸۵۷ء اور آج / احمد سلیم۔ لاہور: شرکت پرنٹنگ، ۱۹۸۹ء

۶۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد / غلام رسول مہر۔ لاہور: کتاب منزل، ۱۹۶۰ء

۷۔ احسن التقاسیم / بشاری مقدسی۔ لیڈن

۸۔ اخبار الاخیار / شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ دہلی: مطبع مجتبائی، ۱۸۹۲ء

۹۔ ادبیات فارسی میں ہندووں کا حصہ / ڈاکٹر سید عبد اللہ۔ نئی دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء

۱۰۔ اردو ادب کی تاریخ / نسیم قریشی۔ علی گڑھ: فرینڈس بک، ۱۹۶۴ء

۱۱۔ اردو ادب کی تاریخ مع حواشی و تعلیقات / ٹی۔ گراہم بیلی؛ مترجمہ سید محمد عصیم۔ دہلی: تاج پرنٹرس، ۱۹۹۳ء

۱۲۔ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری / ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء

۱۳۔ اردو قومی شاعری کے سو سال / علی جواد زیدی۔ لکھنؤ: اردو اکادمی، ۱۹۸۲ء

۱۴۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں / ڈاکٹر گیان چند جین۔ علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۹ء

۱۵۔ اردوے معلیٰ (۱۔۲) / غالب۔ دہلی: مطبع مجتبائی

۱۶۔ ارمغان پاک / شیخ محمد اکرام۔ کراچی: ادارہ مطبوعات، ۱۹۵۳ء

۱۷۔ ارمغان گوکل پرشاد / گوکل پرشاد

۱۸۔ اسالیب نثر پر ایک نظر / ڈاکٹر ضیاء الدین۔ دہلی: ادارہ فکر جدید، ۱۹۸۹ء

۱۹۔ امام بخش صہبائی شخص شاعر شارح / ڈاکٹر خواجہ محمد حامد۔ ناگپور، ۱۹۸۲ء

۲۰۔ اہل دہلی / سر سید احمد خاں: مرتبہ قاضی احمد میاں جوناگڑھی۔ پاکستان: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵

۲۱۔ انتخاب یادگار / امیر مینائی۔ تاج المطابع، ۱۸۸۰ء

۲۲۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء / مفتی انتظام اللہ شہابی۔ دہلی: دینی بکڈپو

۲۳۔ بحر الفصاحت / حکیم نجم الغنی خاں رامپوری۔ لکھنؤ: نولکشور، ۱۹۲۷ء

۲۴۔ بزم سخن / سید علی حسن خاں۔ آگرہ: مفید عام، ۱۸۸۱ء

۲۵۔ بہادر شاہ ظفر / منشی امیر احمد علوی۔ لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۳۵ء

۲۶۔ بہادر شاہ ظفر / اسلم پرویز۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۶ء

۲۷۔ بہار بے خزاں / احمد حسین سحر۔ دلی: علمی مجلس، ۱۹۶۸ء

۲۸۔ بہارستان ناز / محمد فصیح الدین رنج۔ میرٹھ، ۱۸۸۲ء

۲۹۔ پنج آہنگ / غالب: مرتبہ محمد عمر مہاجر۔ کراچی، ۱۹۶۹ء

۳۰۔ پنج رقعہ / ارادت خاں واضح۔ لکھنؤ: نولکشور، ۱۹۶۰ء

۳۱۔ تاریخ ادب اردو / رام بابو سکسینہ: ترجمہ مرزا محمد عسکری۔ لکھنؤ: تیج کمار، ۱۹۶۹ء

۳۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

۳۳۔ تاریخ مشائخ چشت / پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ دلی: ادارہ ادبیات، ۱۹۸۴ء

۳۴۔ تحریک آزادی اور مسلمان / اسیر ادروی۔ دیوبند: دار المؤلفین، ۱۹۸۸ء

۳۵۔ تحفۃ الشعرا / مرزا افضل بیگ قاقشال: مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل۔ حیدر آباد، ۱۹۶۱ء

۳۶۔ تحقیقی مضامین / مالک رام۔ دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۴ء

۳۷۔ تذکرہ آزردہ / مفتی صدر الدین آزردہ: مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد۔ پاکستان:

انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۴ء
۳۸۔ تذکرہ ابن طوفان / ابن امین اللہ طوفان ؛مرتبہ قاضی عبد الودود۔ پٹنہ: خدابخش لائبریری، ۱۹۹۵ء
۳۹۔ تذکرہ حیدری / سید حیدر بخش حیدری ؛مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد۔ دلی: علمی مجلس، ۱۹۶۷ء
۴۰۔ تذکرہ ریختہ گویان / سید فتح علی حسینی گردیزی؛مرتبہ مولوی عبد الحق۔ انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء
۴۱۔ تذکرہ الشعرا / محمد عبد الغنی۔ علی گڑھ :انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۱۶ء
۴۲۔ تذکرہ شعراے اردو / میر حسن دہلوی۔ علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۱۹۲۱ء
۴۳۔ تذکرہ شوکت نادری / کلب حسین خاں نادر؛ترجمہ و ترتیب ڈاکٹر شاہ عبد السلام۔ لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۸۴ء
۴۴۔ تذکرہ علماے ہند / مولوی رحمان علی ؛مرتبہ محمد ایوب قادری۔ کراچی، ۱۹۶۱ء
۴۵۔ تذکرہ کاملان رامپور / احمد علی شوق۔ پٹنہ: خدابخش لائبریری،
۴۶۔ تذکرہ ہندی گویاں / غلام مصحفی ہمدانی ؛مرتبہ مولوی عبد الحق۔ انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء
۴۷۔ تصانیف احمدیہ (۱۔ ۴) / سر سید احمد خاں ۔ علی گڑھ :انسٹی ٹیوٹ، ۱۸۸۲ء
۴۸۔ تین تذکرے / تلخیص و ترجمہ نثار احمد فاروقی۔ دہلی، ۱۹۶۸ء
۴۹۔ جامع القواعد / ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۱ء
۵۰۔ چشمہ کوثر / شیخ محمد اکرام۔ بمبئی: تاج آفس
۵۱۔ چمن انداز / درگا پرشاد نادر۔ دہلی، ۱۸۷۶ء
۵۲۔ چمنستان شعرا / لچھمی نراین شفیق ؛مرتبہ مولوی عبد الحق۔ انجمن ترقی اردو، ۱۹۲۸ء
۵۳۔ حدائق البلاغت / شمس الدین فقیر۔ پٹیالہ :نولکشور، ۱۸۷۲ء

۵۴۔ حیات جاوید / خواجہ الطاف حسین حالی۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۲۹ء

۵۵۔ خزینۃ العلوم / منشی درگا پرشاد نادر۔ لاہور: مفید عام

۵۶۔ خطبات گارساں دتاسی۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۳ء

۵۷۔ خطوط غالب / مرتبہ غلام رسول مہر۔ لاہور: کتاب منزل

۵۸۔ خطوط غالب / مرتبہ مالک رام۔ علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۲ء

۵۹۔ خم خانہ جاوید (۱۔۵) / لالہ سری رام۔ دہلی، ۱۹۰۸۔۱۹۳۰ء

۶۰۔ خوش معرکہ زیبا / سعادت خاں ناصر؛ ترجمہ و ترتیب عطا کاکوی۔ پٹنہ، ۱۹۶۸ء

۶۱۔ داستان تاریخ اردو / حامد حسن قادری۔ آگرہ: عزیزی پریس، ۱۹۵۷ء

۶۲۔ داستان غدر / ظہیر دہلوی۔ لاہور، ۱۹۵۵ء

۶۳۔ دستور الفصاحت / احمد علی یکتا؛ مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی۔ رامپور: ہندوستانی پریس، ۱۹۴۳ء

۶۴۔ دفتر گم گشتہ: بہار میں اردو شاعری کا ارتقا / کلیم عاجز۔ پٹنہ: کلیم عاجز اکادمی، ۱۹۹۸ء

۶۵۔ دلی کا دبستان شاعری / ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۹ء

۶۶۔ دلی کی آخری بہار / راشد الخیری۔ دہلی: محبوب المطابع، ۱۹۳۷ء

۶۷۔ دہلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ / ناصر نذیر فراق۔ دہلی: شاہجہاں بک ایجنسی

۶۸۔ دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ / مرزا فرحت اللہ بیگ۔ لاہور: سنگ میل

۶۹۔ دہلی کی آخری شمع / مرزا فرحت اللہ بیگ۔ دلی: پرنٹنگ ورکس، ۱۹۴۰ء

۷۰۔ دہلی کی جانکنی / خواجہ حسن نظامی۔ دہلی: حلقہ مشائخ، ۱۹۲۳ء

۷۱۔ دو تذکرے / مرتبہ کلیم الدین احمد۔ پٹنہ، ۱۹۵۹۔ ۱۹۶۳ء

۷۲۔ دیوان جہاں / بینی نراین جہاں؛ مرتبہ کلیم الدین احمد۔ پٹنہ، ۱۹۵۹

۷۳۔ دیوان ذوق / ذوق دہلوی؛ مرتبہ محمد حسین آزاد۔ دہلی، ۱۹۳۳ء

۷۴۔ رسالہ تذکرات / ذکاء اللہ دہلوی؛ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔

۷۵۔ روز روشن / محمد مظفر حسین صبا۔ بھوپال، ۱۲۹۷ھ

۷۶۔ ریاض الفردوس / محمد حسین خاں۔ لاہور، ۱۹۶۸ء

۷۷۔ ریاض الفصحا / مصحفی؛ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ اورنگ آباد، ۱۹۴۳ء

۷۸۔ سخن شعرا / عبدالغفور نساخ۔ لکھنؤ: نولکشور، ۱۸۷۴ء

۷۹۔ سراپا سخن / محسن لکھنوی؛ مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن۔ لاہور، ۱۹۷۰ء

۸۰۔ سفینہ رحمانی / حافظ عبدالرحمٰن حیرت۔ نولکشور، ۱۸۸۴ء

۸۱۔ سیر المصنفین / محمد یحییٰ تنہا۔ لاہور، ۱۹۴۸ء

۸۲۔ شعرا کے تذکرے / ڈاکٹر سید عبداللہ۔ لاہور، ۱۹۶۱ء

۸۳۔ شمع انجمن / نواب صدیق حسن خاں۔ دہلی، ۱۲۹۳ھ

۸۴۔ شمیم سخن (۱۔۲) / محمد عبدالحی صفا۔ لکھنؤ: نولکشور، ۱۸۹۱ء

۸۵۔ صحیفہ خوش نویساں / احترام الدین شاغل۔ انجمن ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۷ء

۸۶۔ صہبائی ایک مختصر تعارف / ڈاکٹر محمد انصار اللہ۔ علی گڑھ، ۱۹۸۶ء

۸۷۔ طبقات سخن / شیخ غلام محی الدین؛ مرتبہ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی۔ لکھنؤ، ۱۹۷۱ء

۸۸۔ طبقات الشعرا / قدرت اللہ شوق؛ مرتبہ نثار احمد فاروقی۔ لاہور، ۱۹۱۸ء

۸۹۔ طبقات شعرائے ہند / مولوی کریم الدین۔ دہلی، ۱۸۴۸ء

۹۰۔ طور کلیم / سید نور الحسن۔ آگرہ، ۱۲۹۸ھ

۹۱۔ عروس الاذکار / نصیر الدین نقش؛ مرتبہ افسر امروہوی۔

۹۲۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی / مولانا سید محمد میاں۔ دہلی، ۱۹۸۵ء

۹۳۔ عمدہ منتخبہ / نواب اعظم الدولہ سرور؛ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی، ۱۹۶۱ء

۹۴۔ عود ہندی / غالب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۴ء

۹۵۔ غالب اور صفیر / مشفق خواجہ۔ کراچی، ۱۹۸۱ء

۹۶۔ غالب / غلام رسول مہر۔ امر تسر

۹۷۔ غدر کے چند علما / مفتی انتظام اللہ شہابی۔ دہلی

۹۸۔ فرح بخش / نواب یار محمد خاں شوکت۔ کانپور، ۱۲۸۸ھ

۹۹۔ فوائد الفواد / حسن سجزی۔ لکھنؤ، ۱۳۰۲ھ

۱۰۰۔ قاطع برہان / غالب؛ مرتبہ قاضی عبد الودود۔ ۱۹۶۷ء

۱۰۱۔ قطعہ منتخب / عبد الغفور نساخ۔ کراچی، ۱۹۷۴ء

۱۰۲۔ فن تنقید اور شعرا پر تنقیدیں / صغیر حسین خاں۔ لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۰۳۔ قواعد اردو / مولوی عبد الحق۔ لکھنؤ، ۱۹۱۴ء

۱۰۴۔ قواعد زبان اردو / گل کرسٹ؛ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی۔ لاہور، ۱۹۶۲ء

۱۰۵۔ کلیات سودا (۱۔ ۲) / مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن۔ نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

۱۰۶۔ کلیات شاہ نصیر / مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی۔ لاہور، ۱۹۷۱ء

۱۰۷۔ گلدستہ نازنیناں / مولوی کریم الدین۔ دہلی، ۱۸۴۵ء

۱۰۸۔ گل رعنا / مولوی سید عبد الحی۔ اعظم گڑھ، ۱۳۴۲ھ

۱۰۹۔ گلزار ابراہیم / ابراہیم خلیل؛ تلخیص و ترجمہ عطا کاکوی۔ پٹنہ، ۱۹۲۸ء

۱۱۰۔ گلستان بے خزاں / مرزا قطب الدین باطن۔ لکھنؤ: اردو اکادمی

۱۱۱۔ گلستان سخن / مرزا قادر بخش صابر۔ لکھنؤ: نولکشور، ۱۸۸۳ء

۱۱۲۔ گلشن بے خار / نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ لکھنؤ: نولکشور، ۱۹۱۰ء

۱۱۳۔ گلشن سخن / مردان خاں مبتلا۔ علی گڑھ: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء

۱۱۴۔ گلشن گفتار / حمید اورنگ آبادی؛ مترجمہ ایم۔ کے۔ فاطمی۔ لکھنؤ: دانش محل، ۱۹۶۳ء

۱۱۵۔ گلشن ہمیشہ بہار / نصر اللہ خاں خویشگی۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۷ء

۱۱۶۔ گل عجائب / اسد علی خاں تمنا؛ مرتبہ مولوی عبد الحق۔ انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳

۱۱۷۔ مجموعہ واسوخت / منشی فدا علی عیش۔ لکھنؤ: نولکشور، ۱۲۸۵ھ

۱۱۸۔ مخزن شعرا / فائق رضوی؛ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۳ء

۱۱۹۔ مخزن فوائد / نیاز علی بیگ نکہت دہلوی؛ مرتبہ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین۔ پٹنہ: خدابخش لائبریری، ۱۹۹۸ء

۱۲۰۔ مخزن نکات / محمد قیام الدین قائم۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء

۱۲۱۔ مدائح الشعرا / عنایت حسین خاں مہجور؛ مرتبہ افسر صدیقی۔ پاکستان، ۱۹۷۶ء

۱۲۲۔ مرحوم دہلی کالج / مولوی عبدالحق۔ اورنگ آباد: انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۲ء

۱۲۳۔ مسالک و منازل / ضیاء احمد بدایونی۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۵ء

۱۲۴۔ مسرت افزا (تذکرہ) / امر اللہ الہ آبادی؛ تلخیص و ترجمہ عطا کاکوی۔ پٹنہ، ۱۹۶۸ء

۱۲۵۔ مضمون نگاری / اخلاق دہلوی۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۱ء

۱۲۶۔ مفتاح التواریخ / طامس ولیم۔ کانپور: نولکشور، ۱۸۶۷ء

۱۲۷۔ مقالات سرسید / مرتبہ محمد عبداللہ خویشگی۔ لاہور

۱۲۸۔ مقالات شبلی (جلد ۲)۔ اعظم گڑھ: معارف پریس، ۱۹۳۱ء

۱۲۹۔ مقالات شیرانی / حافظ محمود شیرانی؛ مرتبہ مظہر محمود شیرانی۔ لاہور: مجلس ترقی ادب

۱۳۰۔ نتائج الافکار / قدرت اللہ خاں گوپاموی۔ مدراس، ۱۲۵۹ھ

۱۳۱۔ نقش آزاد / غلام رسول مہر۔ لاہور: کتاب منزل

۱۳۲۔ نکات الشعرا / تقی میر؛ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ پاکستان: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء

۱۳۳۔ نوائے آزادی / عبدالرزاق قریشی

۱۳۴۔ واقعات دارالحکومت دہلی / مولوی بشیرالدین۔ آگرہ: شمسی پریس، ۱۳۳۷ھ

۱۳۵۔ یادگار شعرا / اسپرنگر؛ مترجمہ طفیل احمد۔ الہ آباد، ۱۹۴۳ء

۱۳۶۔ یادگار غالب / خواجہ الطاف حسین حالی۔ لاہور

فہارس مخطوطات

۱۔ تذکرہ مخطوطات (جلد ۴) / ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ حیدر آباد: ادبیات اردو، ۱۹۵۸ء

۲۔ جائزہ مخطوطات (اول) / مشفق۔ لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء

۳۔ فہرست کتب خانہ انڈیا آفس (چہارم) / اے۔ جے۔ آربری۔ لندن، ۱۹۳۷ء

۴۔ فہرست کتب مطبوعہ فارسی برٹش میوزیم / ای۔ ایڈورڈز۔ ۱۹۲۲ء

۵۔ فہرست مخطوطات فارسی / مولوی عبد المقتدر۔ پٹنہ: خدا بخش لائبریری، ۱۹۱۲ء

۶۔ فہرست مخطوطات اودھ (اول) / اے۔ اسپرنگر۔ لندن، ۱۹۵۴ء

۷۔ فہرست مخطوطات بوڈلین لائبریری (اول) / زخاؤ، ایتھے۔ آکسفورڈ، ۱۸۸۹ء

۸۔ فہرست مشترک (پنجم) / احمد منزوی۔ اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

۹۔ فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی موزہ ملی / سید عارف نوشاہی۔ پاکستان، ۱۹۸۳ء

۱۰۔ فہرست نمائش ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ / قاضی محمد سعید۔ پٹنہ، ۱۹۵۹ء

۱۱۔ ملیشیا میں اردو، فارسی اور عربی مخطوطات کی ایک دستی فہرست / ڈاکٹر محمد ذاکر حسین۔ پٹنہ: خدا بخش لائبریری، ۱۹۹۷ء

۱۲۔ ہمدرد میں محفوظ اردو رسائل و اخبارات / شکیل احمد شمسی، ڈاکٹر محمد ذاکر حسین۔ پٹنہ: خدا بخش لائبریری، ۱۹۹۳ء

رسائل

۱۔ برہان، نئی دہلی، ستمبر ۱۹۹۷ء (امام بخش صہبائی اور ان کی فارسی شاعری / ڈاکٹر محمد ذاکر حسین)

۲۔ بیاض، دہلی، شمارہ ۱۹۹۰ء، انجمن فارسی دہلی

۳۔ جمنا تٹ، ہریانہ، جولائی ۱۹۹۷ء(تلامذۂ صہبائی /ڈاکٹر محمد ذاکر حسین)

۴۔ شیرازہ، سری نگر، جلد ۳، شمارہ ۹۔۱۰(امام بخش صہبائی کی فارسی شاعری/ڈاکٹر محمد ذاکر حسین)

۵۔ غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۸۱ء(مولانا صہبائی کا انتخاب دواوین/ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی)

۶۔ غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۸۲ء(صہبائی، شخص شاعر اور شارح/ڈاکٹر ڈاکٹر سمیع الدین احمد)

۷۔ معارف، اعظم گڑھ، جلد ۷۳۔ ۷۴

۸۔ معارف، اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۶ء(امام بخش صہبائی کی تنقید نگاری/ڈاکٹر محمد ذاکر حسین)

۹۔ نگار، رامپور، کراچی، فروری ۱۹۶۳ء

۱۰۔ نوائے ادب، ممبئی، اپریل ۱۹۹۷ء(امام بخش صہبائی اور اردو زبان و ادب /ڈاکٹر محمد ذاکر حسین)

۱۱۔ نیا دور ، لکھنؤ، اگست ۱۹۹۸ء(امام بخش صہبائی کی شہادت/ڈاکٹر محمد ذاکر حسین)

English Books

1-Early Persian Poets Of India by Dr.Iqbal Husain,Patna,1937.

2-Pre-Mughal Persian In India by M.G.Ghani ,Allahabad,1941.

3-Muslim Political Thought Through The Ages 1562-1947 by G.Allana.Karachi,1989.

کچھ مصنف کے بارے میں

نام	:	ڈاکٹر محمد ذاکر حسین
والد کا نام	:	الحاج حافظ محمد محی الدین صاحب (پیدائش ۱۹۳۶ء)
پیدائش	:	۱۰/ فروری ۱۹۶۷ء، بونسی، مدھوبنی (بہار)
اسناد	:	پی ایچ۔ ڈی، ایم۔ اے (اردو، فارسی، عربی) بی۔ ایڈ، بی۔ لب اینڈ انفارمیشن سائنس عالمیت (ندوۃ العلماء، لکھنؤ)
مشغولیت	:	لائبریری اینڈ انفارمیشن اسسٹنٹ، خدابخش لائبریری، پٹنہ
تصنیفات / تالیفات	:	تلمیحات واشارات حافظ، خلاصہ انیس الطالبین، اختیار الرفیق لطلاب الطریق، مخزن فوائد، ملیشیا میں محفوظ اردو، فارسی اور عربی مخطوطات کی ایک دستی فہرست، ہمدرد میں محفوظ اردو رسائل واخبارات، خدابخش کے نادر عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست (تین جلدیں)، دیوان اظہر علی آزاد کاکوروی، امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات، نذرِ خدابخش، محاورات نکہت (زیر طبع)، افکار ذاکر مکاتیب کی روشنی میں (زیر طبع)، نکہت دہلوی: حیات وخدمات (زیر تحقیق)

☆☆☆

IMAM BAKHSH SEHBAI KI
ADABI KHIDMAT
By : Dr. Mohammad Zakir Husain
Distributors :
KITABISTAN
Chandwara, Muzaffarpur-842001